مونوگراف
شیخ محمد ابراہیم ذوق
کوثر مظہری

مونوگراف

شیخ محمد ابراہیم ذوق

کوثر مظہری

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

پہلی اشاعت	:	2016
تعداد	:	550
قیمت	:	-/72 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1877

Shaikh Mohd Ibraheem Zauque

By: Prof. Kausar Mazhari

ISBN :978-93-5160-112-8

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025 فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

ہمارا دور بھی عجیب ہے ایک طرف جہاں اردو زبان کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے تو دوسری جانب دوریاں نزدیکیوں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ جدید تکنیکی انقلاب نے معلومات کے سمندر کو کوزے میں سمیٹ کر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے ایسے میں اس خوف کا دامنگیر ہونا خلاف واقعہ نہیں کہ ہمارا قدیم و کلاسیکی ادب اس تکنیکی طلاطم کا شکار نہ ہو جائے۔

اپنے نابغہ ادیبوں و شاعروں پر مونوگراف لکھوانے کے اس نئے سلسلے کا آغاز اسی لیے کیا گیا ہے تا کہ ہم نئی نسل کے سامنے کم سے کم صفحات میں معروف ادبا کا سوانحی خاکہ بھی پیش کر سکیں اور ان کی تحریروں کے منتخب نمونے بھی۔

قومی کونسل نے اس سلسلے میں موجودہ اہم اردو قلمکاروں کی خدمات حاصل کی ہیں اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم قارئین کو براہ راست اپنے اس تجربے میں شامل کریں۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اہم ادیبوں پر مونوگراف شائع کر دیں اور یہ بھی کوشش ہے کہ یہ مونوگراف معلومات کا ذخیرہ بھی ہو، اب اس معیار کو ہم کس حد تک حاصل کر سکے اس کا فیصلہ آپ کریں گے لیکن آپ سے یہ گزارش ضرور ہے کہ اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں ضرور نوازیں تا کہ ہم آئندہ ان مشوروں کو نشانِ منزل بنا سکیں۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
ڈائرکٹر

فہرست

ابتدائیہ

جب مجھے شیخ محمد ابراہیم ذوق پر مونوگراف لکھنے کا دعوت نامہ ملا تو بڑی خوشی ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے لیے کام کرنا اور وہ بھی تصنیف و تالیف کا کام کرنا، میرے نزدیک باعثِ فخر ہے۔ ایک دوسری وجہ یہ بھی رہی کہ شیخ محمد ابراہیم ذوق ایک ایسے عہد کے شاعر ہیں جو کہ تاریخی اور تہذیبی اعتبار سے بے حد اہمیت کا حامل رہا ہے۔ چونکہ ذوق سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے استاد شاعر بھی تھے، اس لیے بھی یہ ایک دلچسپ مطالعہ تھا کہ آخر ذوق کی شہرت اپنے عہد میں سب سے زیادہ کیوں تھی اور امتدادِ زمانہ کے بعد ماندی کیوں پڑ گئی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غالب جو ان کے معاصرین میں شامل تھے، اس عہد میں ذوق جیسی شہرت نہیں رکھتے تھے، لیکن دھیرے دھیرے کلام غالب نے اپنے تمام معاصرین بشمول ذوق، سب میں اپنا مقام بلند بنالیا۔ ایسے کئی سوال تھے جو مطالعے کے دوران کسی قدر حل بھی ہوئے اور بحث کے مزید دروازے بھی کھلتے گئے۔

یوں بھی دیکھا جائے تو ادب میں مسائل اور سوال حل کرنے سے زیادہ اہم ہے سوال قائم کرنا اور مباحث کے دروازے کھولنا، سو یہاں بھی یہ ادنیٰ سی کوشش کی گئی ہے۔

ابراہیم ذوق کی شخصیت اور شعری کردار کا بغور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوا کہ وہ دہلی کے روزمرّوں اور محاوروں پر پوری قدرت رکھتے تھے تھے اور مرنجاں مرنج شخصیت کے حامل انسان تھے۔ اپنی زندگی میں شعری مجموعہ شائع نہیں کرایا اور بہادر شاہ ظفر کے دیوان کے چھپ جانے کو ہی اہم جانتے تھے۔ 'آب حیات' میں ذوق کے شاگرد رشید محمد حسین آزاد نے لکھا ہے استاد اکثر ان کی (بہادر شاہ ظفر) غزل بنا آیا کرتے تھے۔ اسپرنگر نے اپنے تذکرے 'یادگار شعرا' میں بہادر شاہ ظفر کے دیوان کو ذوق ہی سے منسوب کر دیا ہے۔ یہ حوالہ تنویر احمد علوی نے اپنی کتاب 'ذوق، سوانح اور انتقاد' میں پیش کیا ہے۔ ذوق اور ظفر کے رشتے کو مرزا آغا جان عیش نے طنز کے طور پر کچھ یوں پیش کیا ہے۔

شاگرد اور استاد میں ہوتا ہے فرق پر
طرزِ سخن میں ذوق و ظفر دونوں ایک ہیں

یعنی، یہ گوشۂ تاریخ و حیات دلچسپی سے خالی نہیں۔

جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے، ذوق نے اپنی غزلوں میں کلاسیکی اسلوب اور زبان دانی کا پورا پورا اہتمام کیا ہے۔ طرز ادا میں اجتہاد اور برجستگی نہ سہی، مگر زبان کے برتنے میں وہ کسی طرح کا سمجھوتہ نہیں کرتے۔ کلام میں چستی اور صفائی کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ شاید اس میں اُن کے استاد شاہ نصیر کی تربیت کا بھی رول تھا جس نے انھیں لفظی اور ظاہری حسن کاری کی طرف لگا دیا تھا۔ ان کے یہاں لکھنؤ کے استاد امام بخش ناسخ کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ ذوق کی زبان دانی، مشقِ سخن وری، فصاحت عبارت اور پاکی الفاظ کی داد تو سرسید نے بھی 'آثار الصنادید' (طبع اوّل، ص 216) میں دی ہے۔

ذوق کی شاعری اور شاعری میں استادی کا جلوہ غزل گوئی سے زیادہ قصیدہ نگاری میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ان کے معاصرین میں مومن اور غالب دونوں کے قصیدے ذوق کے بعد ہی آتے ہیں۔ اس صنف میں ذوق کی تخلیقیت اپنے پورے شباب پر نظر آتی ہے۔ مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات کا استعمال ہو یا مشکل زمینوں کا انتخاب، ذوق اپنے فن میں پختہ اور واقعی استاد نظر آئے ہیں۔ حالی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اول سودا اور

آخر ذوق، صرف یہ دو شخص ہیں جنھوں نے ایران کے قصیدہ گویوں کی روش پر کم و بیش قصیدے لکھے ہیں۔ حالی نے تو لکھا ہی ہے، اگر ہم غور کریں تو قصائد کے سرمایہ میں ذوق کی قصیدے کی اہمیت سودا کے بعد واقعی سب سے زیادہ ہے۔ یعنی اگر نمبر ایک پر سودا کو رکھا جائے تو ذوق کو نمبر دو پر رکھنے میں شاید اردو ادب کے کسی بھی ناقد یا قاری کو ذرا بھی تامل نہیں ہوگا اور نہ ہونا چاہیے۔

ذوق پر یہ مونوگراف لکھتے ہوئے، جو کچھ بھی میں نے مطالعہ کیا، اس سے اس بات کا اندازہ ضرور ہوا کہ نقادوں میں یہ رویہ عام رہا ہے کہ ذوق کی غزل گوئی کے سامنے غالب کی غزل گوئی کو لا کھڑا کرتے ہیں اور قصیدہ نگاری کے باب میں سودا کو لے آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں مایوسی ہی ہاتھ آئے گی۔ ذوق کی شاعری کی تحسین و تکریم کے لیے ہمیں تناظر سے زیادہ خود ذوق ہی کے متون پر نگاہ مطالعہ مرتکز رکھنا ہوگا، شاید اس طرح ہم ذوق کے کلام کی داد بھی دے سکتے ہیں اور اُن کے شعری متون کی تعبیر و تشریح بھی پیش کی جا سکتی ہے۔

آخر میں اس مونوگراف کے لیے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے یہ موقع فراہم کیا کہ ذوق جیسے ایک پُرگو کلاسک شاعر کا مطالعہ پیش کرسکوں۔

کوثر مظہری

شخصی و سوانحی پس منظر

اصل نام : شیخ محمد ابراہیم
تخلص : ذوق
والد : شیخ محمد رمضان
پیدائش : 1203ھ بمطابق 1788
1204ھ بہ روایت محمد حسین آزاد

ذوق کی زندگی اور کوائف پر یہاں کئی حوالوں سے روشنی ڈالی جائے گی۔ یعنی، حوالۂ اولی سے لے کر ثانوی حوالے تک سے مدد لی جائے گی۔ لیکن سب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے شاگرد رشید اور صاحبِ 'آبِ حیات' کے حوالے سے ایک اقتباس پیش کر دیا جائے:

''جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہان میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آبِ حیات اس پر شبنم ہو کر برسا

کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز یہ امید نہیں کہ ایسا قادرالکلام پھر اس ہندوستان میں پیدا ہو۔"

(آبِ حیات، اتر پردیش اردو اکادمی، 1982، ص 420)

ذوق کے بارے میں آزاد نے جس طرح کی واقعہ نگاری کی ہے اور ان کی زندگی، ان کے خاندان اور معاصرین، ان کے اساتذہ اور ان کے اور اپنے والد مولوی محمد باقر کے روابط کا جس خوب صورت اسلوب میں ذکر کیا ہے، وہ اپنے اندر کشش اور اثر دونوں رکھتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ آزاد اپنے زمانے کے سب سے بڑے انشاپرداز تھے، اسی لیے تو شاید علامہ شبلی نے کہا تھا کہ آزاد اگر گپ بھی ہانک دے تو الہام معلوم ہوتا ہے۔ ان کی انشاپردازی یا اسلوب تحریر کی داد اس سے بڑھ کر بھلا اور کس انداز میں دی جاسکتی ہے۔

آزاد نے ذوق کا سال پیدائش 1204ھ لکھا ہے جبکہ تنویر احمد علوی نے اپنی تحقیق میں سال پیدائش 1203ھ لکھا ہے اور سال وفات 1271ھ تحریر فرمایا ہے۔ آیئے اس حوالے سے بھی ان کے خاندان اور پس منظر کا بیان آزاد کی زبانی سنتے ہیں:

"شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے مگر زمانہ کے تجربہ اور بزرگوں کی صحبت نے انھیں حالات زمانہ سے ایسا باخبر کیا تھا کہ ان کی زبانی باتیں کتب تاریخ کے قیمتی سرمائے تھے۔ وہ دتی میں کابلی دروازے کے پاس رہتے تھے اور نواب لطف علی خاں نے انھیں معتبر اور بالیاقت شخص سمجھ کر اپنی حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے۔ شیخ علیہ الرحمہ اُن کے اکلوتے بیٹے تھے کہ 1204ھ میں پیدا ہوئے۔" (ایضاً، ص 421)

اس کے آگے لکھتے ہیں:

"اس وقت کسے خبر ہوگی کہ اس رمضان سے وہ چاند نکلے گا جو آسمان سخن پر عید کا چاند ہو کر چمکے گا۔" (ایضاً، ص 421)

اس اقتباس سے اس بات کا اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ ذوق کا خاندانی پس منظر کیسا تھا۔ آزاد نے لکھا ہے کہ ذوق کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے لیکن ان کی زبانی باتیں کتب تاریخ کے قیمتی سرمایے تھے۔ یہ بھی لائق توجہ نکتہ ہے کہ نواب لطف علی خاں نے اپنی حرم سرا کے کاموں کی ذمے داری انھیں دے رکھی تھی۔ اس سے شیخ محمد رمضان کی شریف النفسی کے ساتھ ساتھ ان کی پُر اعتماد اور معتبر شخصیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہاں اگلے اقتباس میں ذوق کی شخصیت اور ان کی سخن طرازی کو کس طرح آسانی سے ایک جملے میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ یہ بھی غور طلب ہے کہ رمضان (جو کہ ذوق کے والد تھے) اور 'عید' میں جو رعایت اور معنوی ربط پیدا کیا گیا ہے، وہ ذوق کی سخن سنجی اور انشا پردازی دونوں پر دال ہے۔ اوپر کے اقتباس کی بازقرأت کیجیے اور آزاد کی سخن پردازی کی داد دیجیے۔

جہاں تک ذوق کی تعلیم و تربیت کا سوال ہے، تو آزاد نے آبِ حیات میں جو لکھا ہے، اسی کو بعد کے بیشتر سوانح نگاروں یا نقادوں نے نقل کیا ہے۔ تنویر احمد علوی صاحب نے بھی آبِ حیات ہی سے اقتباس نقل کیا ہے کہ ایک حافظ غلام رسول ان کے گھر کے پاس تھے، ذوق بھی انہی کے پاس بھیجے گئے۔ یہاں وہ اقتباس نقل نہیں کیا جا رہا ہے کہ اس کو بار بار دہرانا ضروری نہیں۔ آزاد نے آبِ حیات میں ذوق کے تو بار چیچک نکلنے کا ذکر کیا ہے۔ اس بات کا ذکر 'حیاتِ ذوق' کے مصنف احمد حسین لاہوری نے بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "شیخ صاحب کو ابھی مکتب میں گئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ چیچک نے آدبایا اور اس زور سے نکلی کہ تل دھرنے کی جگہ نہ رہی اور نتیجہ یہ ہوا کہ بد بخت مرض نے آئندہ ساری عمر کے لیے ان کا چہرہ بدشکل کر دیا۔"
>
> (حیاتِ ذوق، 1895، ص7)

خیر یہ تو ذکر ہوا کہ ان کے چہرے پر بے شمار چیچک کے داغ تھے جو ظاہر ہے کہ عمر بھر رہے۔ اسی مکتب میں پڑھتے پڑھتے استاد حافظ غلام رسول کی صحبت میں انھیں بہت سے اشعار یاد ہو گئے۔ غلام رسول صاحب، 'شوق' تخلص کرتے تھے اور اسی مناسبت سے جیسا کہ

'حیاتِ ذوق' میں درج ہے، اپنا تخلص ذوق اختیار کیا۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے تذکرے 'گلشن بے خار' کی روشنی میں اگر بات کی جائے تو ذوق نے پندرہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا ہوگا۔ کسی نے (صاحب طبقات الشعرا) یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اپنی ابتدائے عمر سے ہی شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے تھے اور جس کے لیے حافظ غلام رسول شوق کی شاگردی سے بھی انھیں ترغیب ملی ہوگی کہ وہاں محلے کے دوسرے باذوق نوجوان بھی اصلاح کی غرض سے شوق صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ بعد میں اسی محلے کے ایک بزرگ شخص مولوی عبدالرزاق سے حصولِ علم کے لیے رابطہ قائم ہوا۔ اگر تمام کتب اور تذکروں کو دیکھا جائے تو کہیں بھی ذوق کے حصولِ علم اور اس کی تکمیل کا واضح حوالہ نہیں ملتا۔ ذوق کی ملاقات آزاد کے والد محمد باقر سے مولوی عبدالرزاق ہی کے درس میں ہوئی، جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

> "جوں جوں عمر بڑھتی گئی علم کا شوق بڑھتا گیا۔ میاں عبدالرزاق ایک فاضل اس محلے میں صاحب تدریس تھے، ان کے درس میں جا کر شامل ہونے لگے۔ وہیں والد مرحوم سے بھی ملاقات ہوئی اور کئی برس تک دونوں کی تعلیم ایک استاد کے دامن شفقت میں پلتی رہی۔"

(دیوان ذوق مرتبہ: محمد حسین آزاد، ص 4)

'آبِ حیات' میں آزاد نے لکھا ہے کہ خود استاد ذوق نے انھیں سنایا تھا کہ وہ خدا سے دعائیں کرتے رہتے تھے کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آجائے۔ آخر پہلے پہل دو شعر ہوئے جن میں سے ایک حمد کا اور دوسرا نعت کا شعر تھا۔ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ دوستوں کو سنایا کرتے اور انہی دو شعروں کو کاغذوں پر لکھتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ نومشقی کے زمانے میں جو جذبہ اور ولولہ ہوتا ہے، اس کا تو ذکر ہی کیا۔ حیاتِ ذوق کے مصنف احمد حسین خاں لاہوری نے یہ تو لکھا ہے کہ مکتب میں چونکہ ہر وقت شعر و شاعری کا ماحول رہا کرتا تھا جسے دیکھ کر ذوق میں بھی سخن طرازی کا جذبہ پیدا ہوا لیکن انھوں نے دو شعروں میں سے ایک کے حمد اور دوسرے کے نعت کے شعر ہونے پر اپنی طرح روشنی ڈالی ہے کہ یہ شیخ علیہ الرحمہ کے ہوا خواہوں کا من گھڑت یا طبع زاد چٹکلہ ہے۔ لکھتے ہیں:

"میرے خیال میں اصل بات یوں ہے کہ پہلے دو شعر جو شیخ علیہ الرحمہ نے عروض کے قاعدے کے بموجب موزوں کیے وہ بالا رادہ حمد و نعت میں لکھے خواہ کچھ ہی معاملہ ہو... ان دو شعروں کو رنگ برنگ کی روشنائیوں میں لکھتے تھے جو ملتا تھا اُسے سناتے تھے اور پھولے نہ سماتے تھے۔ حافظ غلام رسول نے جب شعر سنے تو کہنے لگے "یہ قدرتی اتفاق بھی فال ہمایوں ہے اور میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ یہ لڑکا صاحب اقبال ہوگا۔ حافظ جی کی تعریف نے سمند ناز پر تازیانے کا کام کیا اور رفتہ رفتہ ان کا اشتیاق اس قدر بڑھا کہ فنا فی الشعر ہوگئے۔" (حیاتِ ذوق، ص 8،9)

شروع میں تو وہ اپنے مکتب کے استاد حافظ غلام رسول شوق سے اصلاح لیتے رہے۔ ان کے ایک ہم سبق اور گہرے دوست میر کاظم تھے جو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے تھے جس کے سبب ان کی شاعری میں چمک سی پیدا ہونے لگی تھی۔ ان ہی کے کہنے پر ذوق بھی شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ لیکن یہ سلسلہ بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ تنویر احمد علوی نے بھی حیات ذوق کے مصنف کے حوالے سے اس پر زیادہ روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

"...لوگوں کی واہ واہ نے شیخ مرحوم کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ ان کا کلام اصلاح کا محتاج نہیں اور اکثر جب غزل اصلاح کے لیے پیش کرتے تو کہا کرتے تھے کہ استاد یہ غزل بڑی عرق ریزی سے کہی ہے اگر کوئی شعر کٹ گیا تو کلیجہ نکل پڑے گا۔ یہ باتیں شاہ نصیر کو ناگوار گزریں۔ ادھر انھیں یاروں نے چمکایا، رفتہ رفتہ طرفین کے دل میں گرہ پیدا ہوگئی۔"

(بحوالہ: ذوق دہلوی، تنویر احمد علوی، مونوگراف، 1992 ساہتیہ اکادمی، ص 22)

اوپر کے اقتباس پر اظہار خیال کرتے ہوئے علوی صاحب نے لکھا ہے کہ:

"یہ بھی ممکن ہے کہ ذوق کی بڑھتی ہوئی شہرت اور مقبولیت سے شاہ نصیر کے احساس برتری کو ٹھیس پہنچی ہو اور انھوں نے ذوق کے مقابلے میں

اپنے بیٹے شاہ وجیہ الدین منیر کو آگے لانا چاہا ہو۔" (ایضاً، ص 22)

احمد حسین خاں لاہوری نے 'حیاتِ ذوق' میں اس بات کی طرف، کہ جس کا ذکر علوی صاحب نے کیا ہے خود بھی اشارہ کیا ہے۔ شاہ نصیر کو اپنے بیٹے سے ذوق کی مسابقت ناگوار گزری۔ ایک روایت یہ بھی ملتی ہے کہ ایک بار ذوق نے سودا کی غزل پر غزل کہی جس کا آخری حصہ (قافیہ اور ردیف) اس طرح تھا— ہم دوش نقش پا، ہم آغوش نقش پا۔ آزاد نے لکھا ہے کہ شاہ نصیر نے یہ غزل دیکھی اور خفا ہو کر یہ کہتے ہوئے غزل پھینک دی کہ استاد کی غزل پر غزل کہتا ہے۔ اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اڑنے لگا۔ اس زمانے میں غالباً اس عمل کو بے ادبی کے زمرے میں رکھا جاتا تھا۔ حالانکہ اساتذہ کی زمینوں میں یا ان کے تتبع میں غزلیں کہنے کی روایت اردو میں بہت ہی مستحکم رہی ہے۔ ولی دکنی سے لے کر آج تک اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مذکورہ اقتباسات اور بیانات سے، اس بات کا اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ ذوق کی قادرالکلامی دیکھ کر شاہ نصیر اندر اندر پریشان ضرور تھے، اور ایک سبب یہ بھی رہا کہ وہ اپنے بیٹے وجیہ الدین منیر کو زیادہ چمکتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہوں گے۔ شاہ نصیر اور ذوق میں چشمک کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ مشاعروں میں اصلاح اور نوک جھونک ہونے لگی۔ چیلنج کے طور پر زمینیں پیش کی جانے لگیں۔ ایک بار تو شاہ نصیر نے ذوق کی غزل پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اس بحر میں غزل کسی نے نہیں کہی تو ذوق نے اس وقت یہ جواب دیا کہ وہ بحریں آسمان سے نازل نہیں ہوئیں بلکہ طبع موزوں نے نئے نئے گل کھلائے ہیں۔ شاہ نصیر کچھ دنوں کے لیے دکن چلے گئے لیکن اندر اندر نفسیاتی کدورت ختم نہیں ہو سکی۔ اس لیے کہ دکن سے آنے کے بعد شاہ نصیر نے پھر اپنی محفل جمانی شروع کی، ذوق بھی شرکت کرنے لگے۔ دکن میں شاہ نصیر نے ایک غزل کہی تھی جس کی ردیف یہ تھی: 'آتش و آب و خاک و باد' جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ جو کوئی اس طرح میں غزل کہے اُسے استاد سمجھوں گا۔ اس چشمک کا فائدہ یہ ہوا کہ استاد ذوق میں اعتماد پیدا ہو گیا۔ ان کی شاعری محفلوں سے لے کر دہلی کی گلیوں میں پڑھی اور گنگنائی جانے لگی۔

شاہ نصیر نے جو چیلنج کیا تھا، اس زمین میں استاد ذوق نے ایک غزل اور تین قصیدے

تحریر فرمائے۔ یہاں تک کہ ایک مشاعرے میں ان کی غزل پر شاہ نصیر کے حامیوں نے کئی طرح سے اعتراضات کرتے ہوئے سنگ میں آتش کے جلنے اور سنگ میں آتش کے ہونے کا ثبوت مانگا۔ جب ذوق نے اپنے قصیدے کا یہ مطلع پڑھا۔

کوہ اور آندھی میں ہوں گر آتش و آب و خاک و باد
آج نہ چل سکیں گے پر آتش و آب و خاک و باد

مذکورہ بالا اعتراضات اسی مطلع پر ہوئے۔ ذوق نے پہلے تو فارسی کا یہ شعر پڑھا۔

پیش از ظہور جلوۂ جانانہ سوختیم
آتش بہ سنگ بود کہ ماخانہ سوختیم

پھر سودا کا یہ شعر پڑھا۔

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہِ طور کا

ظاہر ہے کہ ذوق کے اس جواب نے سب کو لاجواب کر دیا اور مشاعرے میں بقول آزاد"محفل سے ایک ولولہ سا پیدا ہوا"(آبِ حیات: ص438)

تحصیل علم کے حوالے سے پہلے بھی ذکر ہوا کہ ان کی تعلیم کی آخری منزل کہاں تھی، اس کا پتہ نہیں چلتا۔ انھوں نے حافظ غلام رسول کے بعد مولوی عبدالرزاق کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بیچ میں یہ سلسلہ منقطع رہا لیکن جب ادبی معرکوں اور چشمکوں کا دور بڑھا تو شاید انھیں حصول علم سے مزید رغبت ہوئی۔ اس کا ذکر آبِ حیات میں ہے کہ راجا صاحب رام جو املاک شاہ اودھ کے مختار تھے، انھیں یہ شوق ہوا کہ اپنے بیٹے کو کتب علمی کی تحصیل تمام کروائیں، مولوی عبدالرزاق کے شیخ مرحوم کے قدیمی استاد تھے۔ طب اور علم نجوم سے ان کے شغف پر حیات ذوق کے مصنف جناب احمد حسین خاں یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"شیخ مرحوم نے چند روز علم طب کی طرف بھی توجہ کی مگر اس میں جراحی فن قابلہ اور تشریح انسانی کے ادق مسائل کے لیے محنت شاقہ درکار تھی جو یہ برداشت نہ کر سکے۔ آخر یہ کہہ کر ناحق نیم حکیم خطرۂ جان بن کر کیا لوں گا،

اس کو بھی چھوڑ دیا۔ اس کے بعد نجوم و رمل کا شوق ہوا۔ اگر چہ عقلاً و نقلاً
احکام نجوم پر اعتقاد نہ کرنا چاہیے۔ مگر شیخ علیہ الرحمۃ اگر رمالوں اور نجومیوں
کی صحبت پسند کرتے تھے اور میرا ایسا خیال ہے کہ ان کو ضرور اعتقاد تھا۔''

(حیات ذوق، ص 12,13)

وہی ان کے پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ اتفاقاً ایک دن یہ بھی مولوی صاحب کے ساتھ گئے۔ چونکہ ان کی تیزیٔ طبع کا شہرہ ہوگیا تھا، راجا صاحب نے ان سے کہا میاں ابراہیم تم ہمیشہ درس میں شریک رہا کرو۔ چنانچہ نوبت یہ ہوگئی کہ اگر یہ کبھی شغل یا ضرورت کے سبب وہاں نہ جاتے تو راجا صاحب کا آدمی انھیں ڈھونڈ کر لاتا، نہیں تو ان کا سبق ملتوی رہتا۔

(آب حیات، ص 32,33)

تنویر علوی صاحب نے لکھا ہے کہ ذوق کا ذکر بحیثیت ایک شاعر کے، سب سے پہلے تذکرہ مجموعہ نغز (قدرت اللہ قاسم) میں ہوا۔ اس کے بعد خوب چندذکا کے تذکرے 'عیارالشعراٗ' میں ذکر ہوا۔ صدرالدین آزردہ نے تو ذوق کی تیزی طبع اور مشق سخن کی داد ان لفظوں میں دی ہے:

''در بدایت حال اشعار خود بہ نظر محمد نصیرالدین متخلص بہ نصیر کہ از مشاہیر
شعرائے ریختہ گویان دہلی است آوردہ۔ آخر باکثرت مشق درین فن
بجائے رسیدہ کہ امروز در قوت سخن گوئی درا قران و امثال خود ممتاز ہست۔''

(بحوالہ ذوق سوانح اور انتقاد، دسمبر 1963، ص 33)

مشق سخن ہی سے قوت سخن گوئی کو پر پرواز لگا اور شاعری میں چمک بھی مشق سخن ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ ذوق یوں بھی اپنے کلام پر اکثر غور و فکر اور اس میں قطع و برید کرتے رہتے تھے۔ دوسروں کے کلام پر اصلاح کے ساتھ ساتھ خود اپنے کلام پر بھی نظر ثانی کرتے رہتے تھے۔

اسی عہد میں نواب الٰہی بخش خاں معروف تھے جن کا تعلق ایک امیر خانوادے سے تھا اور شعر و ادب کا منجھا ہوا اور بالیدہ ذوق رکھتے تھے۔ ذوق کی شہرت سن کر ملنے کا اشتیاق

ہوا۔ الٰہی بخش اور ذوق کی ملاقات کے حوالے سے آب حیات میں جس طرح آزاد نے لکھا ہے، وہ ملاحظہ کیجیے:

"...استاد مرحوم فرماتے تھے کہ میری 20-19 برس کی عمر تھی۔ گھر کے قریب ایک قدیم مسجد تھی۔ ظہر کے بعد وہاں بیٹھ کر میں وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ ایک چوبدار آیا اس نے سلام کیا اور کچھ چیز رومال میں لپٹی ہوئی میرے سامنے رکھ کر الگ بیٹھ گیا فارغ ہو کر اسے دیکھا تو اس میں ایک خوشہ انگور کا تھا۔ ساتھ ہی چوبدار نے کہا کہ نواب صاحب نے دعا فرمائی ہے، یہ تبرک بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ آپ کا کلام ان کو پہنچا ہے مگر آپ کی زبان سے سننے کو جی چاہتا ہے۔ تیسرے دن تشریف لے گئے، شعر کی فرمائش کی۔ انھوں نے ایک غزل کہنی شروع کی تھی اس کا مطلع پڑھا:

نگہ کا وار تھا دل پر، پھڑکنے جان لگی چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

سن کر بہت خوش ہوئے۔" (آب حیات، ص 428)

آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ:

"اس دن کے بعد ہفتے میں دو دن جایا کرتے اور غزل بنا آیا کرتے تھے۔ چنانچہ جو دیوانِ معروف اب رائج ہے وہ تمام و کمال اُنھی کا اصلاح کیا ہوا ہے۔ استاد کہا کرتے تھے کہ اگرچہ بڑی بڑی کاہشیں اٹھانی پڑیں مگر ان کی غزل بنانے میں ہم آپ بن گئے۔" (آب حیات، ص 429)

آزاد کی باتوں کو یا ان کے دعووں کو یکسر رد تو نہیں کیا جاسکتا مگر جس طرح ان باتوں کا ذکر ہوا ہے وہ ہمیں قدرے توقف کی دعوت بھی دیتا ہے۔ اقتباس اوّل سے یہ واضح ہے کہ ذوق 20-19 برس کی عمر میں امور شرعی اور نماز کے حد درجہ پابند تھے اور نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہے تھے جبکہ ایک چوبدار نواب صاحب کا پیغام لے کر آیا۔ اس وقت الٰہی بخش معروف ضعف اور عبادت و ریاضت کے سبب تقریباً گوشہ نشین ہوگئے تھے، جس کی طرف خود آب حیات میں اشارہ ملتا ہے۔

دوسرے اقتباس میں آزاد نے لکھا ہے کہ ہفتے میں دو دن جا کر معروف کی غزل بنا آیا کرتے تھے اور آج جو دیوان معروف ہے وہ تمام و کمال ذوق ہی کا اصلاح کیا ہوا ہے۔ لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ ''ان کی غزل بنانے میں ہم آپ بن گئے۔'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ معروف صاحب فن شعر میں خود ہی مہارت رکھتے تھے۔ آبِ حیات میں حاشیے میں آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''نواب الٰہی بخش خاں معروف فن شعر کے ماہر کامل تھے۔''

آزاد کے مذکورہ بالا دعووں کی تردید اس بات سے خود ہی ہو جاتی ہے، جیسا کہ تنویر احمد علوی نے بھی ذکر کیا ہے کہ معاصر تذکرے اس ذکر سے خالی ہیں۔ کوئی تذکرہ نگار اس امر کی جانب اشارہ نہیں کرتا کہ انھوں نے شاہ نصیر کے علاوہ کسی اور سے بھی مشورۂ سخن کیا ہے۔ یوں بھی ذوق کی ابتدائی شاعری سے پہلے معروف کا ایک دیوان مرتب ہو چکا تھا۔ اس امر پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جس وقت ذوق کی عمر محض 20-19 برس تھی، اس وقت وہ الٰہی بخش معروف کی شاعری پر کیا اصلاح دینے کے مجاز تھے؟ علوی صاحب نے قدرت اللہ قاسم کے تذکرے 'مجموعہ نغز' سے ایک اقتباس الٰہی بخش معروف کے حوالے سے نقل کیا ہے:

> ''فکر مشق درست و کلامش چست، طبع مستقیم دارد و عقل سلیم۔ دربدوئے شوق سخن سنجی از محمد نصیرالدین نصیر استشارہ نمودہ و حالا بتائید ذہن رسائے خود دیوانے مملو بیشتر انواع سخن تالیف فرمودہ۔''
>
> (بحوالہ: ذوق سوانح و انتقاد، ص 74)

لیکن، تنویر علوی صاحب نے معروف کی ایک غزل ذوق کے خطِ تحریر میں اصلاح کی حالت میں عکس کے ساتھ پیش کردی ہے جس میں معروف تخلص استعمال ہوا ہے۔ پوری غزل تو نہیں مطلع ملاحظہ کر لیجیے:

ہے تیرا بوسۂ رخ و لب اس قدر لذیذ
جس کے مزے کے آگے نہیں گل شکر لذیذ

اس کے اوپر 'یا علی مدد' بھی تحریر ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ ذوق غزل اور

قصیدے میں یا علی مدد یا ہواللہ اکبر لکھ دیا کرتے تھے۔ آخر میں علوی صاحب لکھتے ہیں:

> ''ان شواہد کی موجودگی میں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نواب معروف ذوق سے
> مشورہ سخن بھی فرماتے اور کبھی کبھی بزرگانہ فرمائشیں بھی کرتے تھے، مگر یہ
> لازمی نہیں کہ ان کا تمام تر کلام ذوق کا اصلاح دادہ ہو۔''
>
> (ذوق سوانح اور انتقاد، ص 78)

بہر حال یہ بحث طویل ہوسکتی ہے، لہٰذا اسے یہیں ختم کی جاتی ہے۔ یوں بھی حیات ذوق کے مصنف احمد حسین خاں لاہوری نے بھی معروف کو ذوق کے شاگردوں میں شمار کیا ہے۔ ممکن ہے آئندہ کوئی محقق ان دونوں باتوں یا روایتوں سے بالکل الگ کوئی تحقیق پیش کردے۔

دربار شاہی اور ذوق:

ذوق کا ادبی مرتبہ اپنی جگہ، لیکن ان کی شہرت اور ان کے خلاف ایک طرح کی محاذ آرائی میں دربار شاہی سے ان کے رشتے اور بہادر شاہ ظفر سے ان کے گہرے مراسم کا بھی بڑا کردار رہا ہے۔ روایت یہی ملتی ہے کہ 19 برس کی عمر میں دربار ولی عہدی میں باریابی نصیب ہوئی۔ تنویر علوی صاحب نے دہلی اردو اخبار کے حوالے سے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور فٹ نوٹ میں (ذوق سوانح اور انتقاد، ص 68) بھی درج کیا ہے کہ انھوں نے آغا محمد باقر صاحب، نبیرۂ آزاد کی ملکیت میں موجود مسودۂ 'آبِ حیات' میں دیکھا ہے جس میں صاف طور پر 19 برس لکھا ہوا ہے۔ یہاں یہ سوال فطری طور پر قائم کیا گیا ہے کہ 19 برس کی عمر میں جب وہ دربار شاہی میں داخل ہوئے تو اسی سال انھیں خاقانی ہند کا خطاب کیسے مل گیا؟ علوی صاحب نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ تذکرہ عیار الشعرا، تذکرہ صدرالدین اور تذکرہ سرور میں اس خطاب کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ تذکرہ گلشن بے خار (1248ھ) میں اس خطاب کا ذکر پہلی بار ہوا۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ انھیں خاقانی ہند کا خطاب 1240ھ کے بعد اور 1248 سے پہلے ملا ہوگا۔ علوی صاحب نے لکھا ہے کہ

اس وقت ان کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ ہونی چاہیے۔ اگر اس خطاب کے ملنے کا سال 1246 یا 1247ھ بھی مان لیا جائے تو ان کی عمر 35, 34 برس ہی ہوتی ہے، کیونکہ سال پیدائش 1203 (بمطابق علوی) اور 1204ھ (بمطابق آبِ حیات) درج ہے۔

خیر، اس بحث کو چھوڑیے، جب میر کاظم حسین بے قرار دکن چلے گئے تو ذوق ولی عہد کے استاد شاعری ہوئے۔ 6 اکتوبر 1837 کو اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہوا اور پھر بہادر شاہ ظفر کا جشن تاج پوشی، 7 جنوری 1838 کو ہوا۔ سکہ جاری ہوا۔ امام بخش صہبائی نے اس جشن تاج پوشی کی تاریخ کہی۔ قارئین کے لیے یہ تاریخ لکھی جاتی ہے۔

از سر دولت بہادر شاہی شد پُر مئے طرب ایاغ دہلی
بہ نشست بہ تخت دولت روز افزوں نزہت بہ فزود از دماغ دہلی
تاریخ جلوس آں شہ والا قدر آمد بہ لب خود چراغ دہلی

ذوق نے اسی موقعے پر اپنا وہ مشہور قصیدہ لکھا جس پر انھیں 'ملک الشعراء' کا خطاب ملا۔ حالانکہ آبِ حیات میں قصیدے کا تو ذکر ہے مگر مذکورہ بالا خطاب کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ علوی صاحب نے فٹ نوٹ میں ایک رسالے اسلامک کلچر کے جنوری 1950 جلد 22، نمبر 1 کا حوالہ پیش کیا ہے، جبکہ تاج پوشی 7 جنوری 1838 کو ہوئی۔ اگر 1950 کو سہو کاتب مانتے ہوئے اسے 1850 بھی مان لیں، تب بھی پورے بارہ برسوں بعد اس خبر کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ خیر، وہ قصیدہ جو مشہور ہے اس کا مطلع یہ تھا

روکش ترے رخ سے ہو کیا نورِ سحر رنگِ شفق
ہے ذرّہ تیرا پرتوِ نورِ سحر رنگِ شفق

بعد میں چل کر یہ ہوا کہ دربار میں جب مغل بیگ وزیر ہوئے تو ان کا سارا کنبہ دربار میں بھر گیا۔ ذوق جو کہ بادشاہ کے استاد تھے، انھیں صرف تیس روپے ماہانہ ملا کرتے تھے۔ کسی دوست نے جب ان سے شکایت کی تو استاد ذوق نے حافظ شیرازی کا یہ شعر پڑھا

اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالاں
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خر می بینم

ذوق اور ظفر کے رشتے کو مرزا آغا جان عیش نے بطور طنز کے کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔

شاگرد اور استاد میں ہوتا ہے فرق پر
طرز سخن میں ذوق و ظفر دونوں ایک ہیں

آزاد نے بھی 'آبِ حیات' میں بار بار اس کا ذکر کیا ہے کہ اکثر ان کی غزل بنا آیا کرتے تھے۔ الٰہی بخش معروف کے حوالے سے بھی اور ظفر کے حوالے سے بھی، غزل کی اصلاح اور غزل بنانے والی بات بھی لائق توجہ ہے۔ بہادر شاہ ظفر کو کتنا ملکہ شعر گوئی کا تھا، کوئی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے کہ کچھ شاعری کی بھی ہو، لیکن جتنا کلام (بلکہ ان کا کلام آج تو ضخیم کلیات کی شکل میں موجود ہے) ملتا ہے، اسپرنگر نے تو اپنے تذکرے 'یادگار شعرا' میں ظفر کے شاعر ہونے کو یکسر رد ہی کر دیا ہے۔ تنویر احمد علوی صاحب نے دو چھوٹے اقتباسات درج کیے ہیں جو اس طرح ہیں:

"شیخ محمد ابراہیم ساکن دہلی، یہ اس وقت 1853 (1269ھ) میں حیات ہیں اور اس دیوان کے مصنف ہیں جو شاہ دہلی المتخلص بہ ظفر کا کہا جاتا ہے۔"

مرزا ابوظفر شاہ دہلی ایک دیوان کے مصنف ہیں جو دراصل ذوق کا کہا ہوا ہے۔ (بحوالہ: ذوق سوانح اور انتقاد، ص 96,97)

اس تذکرہ کے مترجم (طفیل احمد) نے فٹ نوٹ میں اسپرنگر کے مذکورہ بالا بیان کو بازاری شہرت سے موسوم کیا ہے۔ علوی صاحب نے دہلی اردو اخبار کے ایک مضمون کا حوالہ دیا ہے، جو کہ ذوق کے گہرے دوست اور محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کا تحریر کردہ ہے۔ ذوق کا دیوان ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا۔ اسی طرف 'دہلی اردو اخبار' کا یہ اقتباس اشارہ کرتا ہے:

"ان کی توجہات سے شاگردوں کے دیوان کئی جلدوں میں مرتب ہو گئے۔ لیکن طرفہ تو یہ کہ اپنا دیوان مرتب نہیں۔ اگر کسی نے احباب و تلامذہ میں سے تکلیف جمعیت دی بھی تو ہنس کر ٹال دیا اور کہا تو یہ کہا کہ حضور والا کا دیوان مقدم ہے۔"

اس پر تنویر احمد علوی کی رائے یوں ہے کہ: 'اس بیان میں 'ٹس کر ٹال دیا' والا فقرہ جو نفسیاتی گہرائی رکھتا ہے اور کہا تو یہ کہا کہ ''حضور والا کا دیوان مقدم ہے'' کی روشنی میں اس پر غور وخوض کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح ذوق کے انتقال کے بعد ان کے تین شاگردوں حافظ ویران، ظہیر دہلوی اور انور نے ان کا دیوان مرتب کیا۔ اس کا دیباچہ انور نے تحریر کیا تھا جس میں یہ جملہ بھی لائق توجہ ہے کہ ظفر کے 'کلام' کی 'اصلاح' کیا ہے اور حقیقت حال کیا ہے۔ اس اشارے سے اسپرنگر کے تذکرے میں جو ذکر ہے کہ ظفر کا دیوان دراصل ذوق کا کہا ہوا ہے، اس کی بھی توثیق ہوتی ہے۔ حافظ ویران لکھتے ہیں:

''چہار دیوانے مجلد بادشاہ کہ شمار اشعارش لاتعد ولاتحصی است تمام وکمال
درست کردہ وچکیدۂ خامۂ فکرش تواں گفت۔''

(دیباچہ دیوان ذوق، مرتبہ ویران، ظہیر وانور، بحوالہ: علوی)

آبِ حیات میں بھی ذکر ہے کہ آزاد کے والد کہا کرتے تھے۔ مسودۂ خاص (ظفر کا) میں کوئی شعر پورا، کوئی ڈیڑھ مصرع، کوئی آدھا مصرع، فقط ردیف وقافیہ معلوم ہوجاتا تھا باقی بخیر۔ وہ یعنی ذوق ان ہڈیوں کے اوپر گوشت پوست چڑھا کر حسن وعشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے۔ ایک حوالہ 'یادگار غالب' میں بھی حالی نے مرزا غالب کے حوالے سے اسی نوع کا پیش کیا ہے۔ ذوق کے بعد غالب ہی بادشاہ ظفر کے استاد شاعری تھے۔ ایک دن ایک چوبدار نے آکر دیوان عام میں غالب سے کہا کہ حضور نے غزلیں مانگی ہیں تو غالب نے اپنے آدمی سے کہا کہ پالکی میں کچھ کاغذ رومال میں رکھے ہیں، وہ لے آؤ۔ اس میں آٹھ نو پرچے جن پر ایک ایک دو دو مصرعے لکھے ہوئے تھے، نکالے اور اسی وقت ان مصرعوں پر آٹھ نو غزلیں کہہ کر بھجوادیں۔

مطلع صاف ہوچکا، جو بھی معاملات مشق سخن یا اصلاح سخن کے طریقے رہے ہوں، ذوق نے بہت کچھ گنوادیا، لیکن غالب نے اپنی شعری اور تخلیقی بساط پر آنچ نہیں آنے دی۔ اپنی زندگی میں دیوان ہی نہیں، اپنے خطوط کا مجموعہ عود ہندی (1868) بھی شائع

کروایا۔ ذوق کی کسر نفسی سے ان کے کلام کا بہت سا حصہ ظفر کے کلام میں گھل مل گیا۔ اپنی زندگی میں اپنا دیوان شائع کرانے کی فکر بھی نہیں کی۔ اسے آپ شانِ بے نیازی تصور کرلیں یا لاپروائی، غلط بحث سے انکار ممکن نہیں، اور ایسی صورت میں سوال کا قائم ہونا فطری ہے۔

شخصیت اور افتادِ طبع:

انسان جو زندگی اور جس طرز پر جیتا ہے اُسی سے شخصیت کی شناخت ہوتی ہے۔ ذوق نے اپنی زندگی میں کسی چیز کے لیے یا منصب اور وظیفے وغیرہ کے لیے حرص و ہوا سے کام نہیں لیا۔ ان میں خشیت الٰہی کا جذبہ بہت تھا۔ اس حوالے سے آزاد نے 'آبِ حیات' میں دو تین حوالے پیش کیے ہیں۔ لکھا ہے کہ عمر بھر اپنے ہاتھ سے جانور ذبح نہیں کیا۔ عالم جوانی میں دوستوں نے قوت باہ کے بڑھانے کا ایک نسخہ بہم پہنچایا۔ ہر ایک کے ذمہ ایک ایک جز مہیا کرنے کی بات ٹھہری۔ مجھے چالیس (40) چڑیوں کا مغز بہم کرنا تھا۔ دو تین چڑے پکڑ کر پنجرے میں ڈالے۔ ان کا پھڑکنا دیکھا نہ گیا۔ سوچا چالیس بے گناہوں کا مارنا کون سی انسانیت ہے، ارادہ ترک کردیا۔ یہاں تک ایک سانپ کو اس لیے نہیں مارا کہ آخر وہ بھی تو جان رکھتا ہے۔ ذوق نے کہا کہ ابراہیم آخر یہ بھی تو جان رکھتا ہے تجھے کے رکعت کا ثواب ملے گا پھر یہ قطعہ پڑھا۔

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد   کہ رحمت برآں تُربت پاک باد
میازار موریکہ دانہ کش است   کہ جاں دارد و جان شیریں خوش است

ان کی شخصیت اور افتادِ طبع کا اندازہ نیچے کے اس اقتباس سے بھی ہوجاتا ہے جسے آزاد نے لکھا ہے، یہاں ہو بہو نقل کیا جاتا ہے:

> ''ایک دفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ قلعہ میں تھے۔ یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے۔ اس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے رع شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت۔ چڑیاں سائبان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں اور ان

کے تنکے جو گرتے تھے انھیں لینے کو بار بار ان کے آس پاس آبیٹھتی تھیں۔
یہ عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی۔ انھوں نے ہاتھ
سے اڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی۔ انھوں نے پھر اڑا دیا۔ کئی دفعہ
ایسا ہوا تو ہنس کر کہا کہ اس غیباتی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا
ہے۔ ایک طرف میں بیٹھا تھا ایک طرف حافظ ویران بیٹھے تھے، وہ نابینا
ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویران
بولے کہ ہمارے سر پر تو آکر نہیں بیٹھتی۔ استاد نے کہا کہ بیٹھے کیوں کر؟
جانتی ہے کہ یہ ملاّ ہے، عالم ہے، حافظ ہے۔ ابھی أحلّ لکم الصید کی
آیت پڑھ کر کلوا واشربو بسم اللہ و اللہ اکبر کردے گا۔ دیوانی
ہے جو تمھارے سر پر آئے۔"

(آبِ حیات، اتر پردیش اردو اکادمی، 1982، ص 45-444)

اس اقتباس سے اس بات کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے اندر بذلہ سنجی اور ظرافت کا مادّہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جس کا اظہار خاص موقعے پر اور بے تکلف محفلوں میں ہوتا تھا۔ پھر یہ کہ اس مذکورہ اقتباس میں ذوق نے جس طرح قرآنی آیت سے انسلاک پیدا کرتے ہوئے اپنے شاگردِ عزیز حافظ ویران پر طنز کیا ہے، وہ بھی لائق توجہ ہے۔
حیاتِ ذوق کے مصنف جناب احمد حسین خاں نے بھی لکھا ہے:

"شیخ ابراہیم ذوق اگرچہ متانت کو ہمیشہ مدِ نظر رکھتے تھے اور اکثر سنجیدگی اور
تھوڑا بولنا پسند کرتے تھے، مگر ان کی طبیعت مذاق اور ظرافت کی چاشنی سے
محروم نہ تھی اور اکثر اپنے چیدہ چیدہ دوستوں کے ساتھ ظرافت آمیز گفتگو
کیا کرتے تھے۔" (ماخوذ: حیاتِ ذوق، 1895، ص 115)

ذوق بچپن میں عام بچوں کی طرح ہی چنچل اور شوخ ہوں گے جس کا اندازہ 'آبِ حیات'
کے ایک اقتباس اور دو شعروں سے ہوتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"ایک دن املی کے درخت میں کنکوا اٹک گیا۔ میں اتارنے کو اوپر چڑھا

اور ایک ٹہنی کو قابل سہارا سمجھ کر پاؤں رکھا۔ وہ ٹوٹ گئی میں نیچے آپڑا۔"

یہ دو شعر بھی ان کے عہد طفلی کو ظاہر کرتے ہیں۔

عہد پیری نے بُھلایا دوڑ چلنا کودنا ۔۔۔ ہائے طفلی کھیلنا، کھانا، اُچھلنا، کودنا

کہاں وہ موسم طفلی کہ ہم دامن سواروں میں ۔۔۔ لیا کرتے تھے کارِ توسنِ رہوار دامن سے

یوں تو بچپن اور لڑکپن میں تقریباً سارے بچے چنچل اور شوخ ہوتے ہیں۔ لیکن ذوق پختہ عمر ہونے کے ساتھ ساتھ خدا ترسی اور زہد و ورع سے قریب ہوتے گئے۔ ان کی شاعری میں بھی ان کی شخصیت اور میلانِ خاطر کے نقوش دیکھے جاسکتے ہیں:

دل صاف ہو تو چاہیے معنی پرست ہو ۔۔۔ آئینہ خاک صاف ہے صورت پرست ہے

درویش ہے وہی جو ریاضت میں چست ہو ۔۔۔ تارک نہیں، فقیر بھی راحت پرست ہے

ذوق بھی بشر تھے اور بشری کمزوریاں لازمی طور پر ان میں بھی رہی ہوں گی۔ ذوق کو جب خاقانی ہند اور ملک الشعرا کا خطاب دیا گیا تو اس وقت ان کی عمر بقول آزاد 19 برس کی تھی۔ ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ کر سنایا تھا جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع و بدائع صرف کیے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ایک زبان میں جو ایک ایک شعر تھا ان کی تعداد 18 تھی۔ (آبِ حیات، ص439)

اس قصیدے کا مطلع یہ ہے۔

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

حالانکہ اس سے قبل اس کی تحقیق علوی صاحب کی بحث کی روشنی میں ہوچکی ہے کہ 19 برس کی عمر میں تو وہ دربارشاہی میں داخل ہی ہوئے تھے۔ علوی نے لکھا ہے کہ اس وقت ان کی عمر 40 برس رہی ہوگی، جبکہ انھیں خاقانی ہند کا خطاب ملا۔ میرے خیال سے 34 یا 35 برس کی عمر ہوگی۔ گذشتہ صفحے پر اس بابت تفصیل ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

اس خطاب کے ملنے پر ذوق کے خلاف آوازیں بھی اٹھائی گئیں۔ آزاد نے ان کے میلانِ طبع اور شخصیت کو اس طرح بھی پیش کیا ہے:

''جب میں اسباب زمانہ کی بے انصافی یا ان کی بے خبری اور بے بصری سے دق ہوکر کچھ کہتا تو فرماتے تھے کہ بے انصافوں ہی میں سے کوئی با انصاف بھی بول اٹھتا ہے، بے خبروں میں باخبر بھی نکل آتا ہے۔ اپنا کام کیے جاؤ۔ 36 برس کی عمر تھی جبکہ جملہ منہیات سے توبہ کی اور اس کی تاریخ کہی کہ اے ذوق بگو سہ بار توبہ'' (آب حیات، ص 440)

ذوق کی عبادت و ریاضت، خدا ترسی اور توکل کا ذکر آب حیات میں بہت ملتا ہے۔ آزاد نے جو بھی ذکر کیا ہے اس میں صداقت بھی ہے۔ یہ بات اس لیے کہی جا رہی ہے کہ بیشتر علمائے ادب میں آزاد کے تئیں یہ تاثر قائم ہے کہ وہ کوئی بات ہو، مبالغہ آرائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ لیکن ادب میں کیا اس کی سرے سے گنجائش نہیں؟ خیر یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا ہے۔ انھوں نے اپنے استاد کے حوالے سے زُہد و ورع، عبادت و ریاضت کے ذکر کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے:

''شیخ مرحوم ضعف جسمانی کے سبب سے روزہ نہ رکھتے تھے مگر اس پر بھی کسی کے سامنے کھاتے پیتے نہ تھے۔ کبھی دوا یا شربت یا پانی بھی پینا ہوتا تو یا کوٹھے پر جا کر یا گھر میں جا کر پی آتے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا۔ کہا کہ میاں خدا کے گنہگار ہیں، وہ عالم نہان و آشکار کا ہے اس کی تو شرم نہیں ہوسکتی۔ بھلا بندے کی تو شرم رہے'' (آب حیات، ص: 466)

'حیات ذوق' کے مصنف جناب احمد حسین خاں لاہوری نے بھی اس بات کی تائید کی ہے کہ شیخ کا مذہب شیعہ تھا اور بڑے ہی متقی اور پرہیزگار تھے۔ البتہ بڑھتی عمر اور جسمانی ضعف کے سبب روزہ رکھنا چھوڑ دیا تھا لیکن کسی کے سامنے کھاتے پیتے نہ تھے۔ ایک واقعہ لکھا ہے:

''ایک دن طبیعت ناساز تھی اور ملازم بھی نیا رکھا تھا اس کو خبر نہ تھی کہ ان کا کیا دستور ہے۔ وہ شربت نیلوفر کٹورے میں گھول کر وہیں لے آیا۔ جب اس نے کٹورا الا کر دیا تو ہنس پڑے اور فی البدیہہ کہا۔

پلا ہے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری
خدا کی گر نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری"

محمد حسین آزاد نے ذوق کے پاک دل ہونے اور ان کے اوراد و وظائف کا ذکر دلچسپ انداز میں لیکن عقیدے کی شدت کے ساتھ کیا ہے۔ یہاں اس کا پیش کیا جانا ضروری ہے کہ ان کی شخصیت اور افتادِ طبع دونوں کے سمجھنے میں معاون ہوگا۔ یہ اقتباس دیکھیے:

"نمازِ عصر کے وقت میں ہمیشہ حاضرِ خدمت ہوتا تھا۔ نہا کر وضو کرتے تھے اور ایک لوٹے سے برابر کلیاں کیے جاتے تھے۔ ایک دن میں نے سبب پوچھا۔ متاسفانہ طور سے بولے کہ خدا جانے کیا کیا جزلیات زبان سے نکلتے ہیں... ایک ٹھنڈی سانس بھری اور یہ مطلع اسی وقت کہہ کر پڑھا:

پاک رکھ اپنا دہاں ذکر خدائے پاک سے
کم نہیں ہرگز زباں مُنھ میں ترے سواک سے

اس کے آگے کا اقتباس بھی ملاحظہ کیجیے:

"ان کا معمول تھا کہ رات کو کھانے سے فارغ ہوکر بادشاہ کی غزل کہتے تھے۔ آدھی بجے تک اس سے فراغت ہوتے تھے۔ پھر وضو کرتے اور وہی ایک لوٹے پانی سے کلیاں کر کے نماز پڑھتے پھر وظیفہ شروع ہوتا... اگر آہستہ آہستہ پڑھتے مگر اکثر اوقات اس جوشِ دل سے پڑھتے تھے کہ معلوم ہوتا گویا سینہ پھٹ جائے گا۔" (آبِ حیات، ص 449)

اس کے بعد یہ لکھا گیا ہے کہ وظیفے کے بعد طویل دعا کرتے جس میں ایمان کی سلامتی، بدن کی صحت، دنیا کی عزت و حرمت، بادشاہ کی اقبال مندی، پھر اپنے بیٹے (میاں اسمٰعیل) پھر دوستوں وغیرہ کے لیے۔ ایک بار کا ذکر دعا یوں ہے کہ آزاد لکھتے ہیں:

"ان کے دروازے کے سامنے محلّہ کا حلال خور رہتا تھا۔ ان دنوں میں اس کا بیل بیمار تھا۔ دعائیں مانگتے مانگتے وہ بھی یاد آ گیا۔ کہا کہ الٰہی ججا حلال خور کا بیل بیمار ہے۔ اُسے بھی شفا دے۔ بچارا بڑا غریب ہے، بیل

مر جائے گا تو یہ بھی مر جائے گا۔ والد نے جب یہ سنا تو بے اختیار ہنس
پڑے۔" (آب حیات، ص 449)

آزاد نے لکھا ہے کہ اس رات ان کے والد ذوق ہی کے گھر پہ تھے۔

اب ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر فیصلہ کیجیے کہ ذوق کی شخصیت سازی میں ان کی تربیت اور فطری افتادِ طبع کا کیا رول رہا تھا؟ مومن اور غالب کی غزل کے سامنے ذوق کی غزل تو کمزور کر دی جاتی ہے لیکن کبھی یہ کوشش نہیں کی گئی (اور اگر کی بھی گئی تو بہ انداز دگر) کہ ذرا ان کے معاصرین میں دیکھا جائے کہ کس کے اندر ایسی بُردباری، جذبۂ انکساری اور یہ معصومیت (جس کا ذکر ابھی اوپر ہوا) پائی جاتی ہے؟ لیکن خیر، یہ چیزیں شاید اضافی ہوتی ہیں کہ بہتر تو یہی ہے کہ متونِ کلام پر ہی توجہ کی جائے۔ البتہ شخصیت اور افتادِ طبع بھی سخن فہمی میں معاون ہوتی ہے، اس بات سے شاید کسی کو انکار بھی نہیں ہوگا اور اسی طرح شاعری سے بھی شخصیت اور میلانِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ کچھ اشعار تو شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے پیش کیے جائیں گے، پھر بھی یہاں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ذوق کی شخصیت اور افتادِ طبع کا اندازہ ہو سکے۔

کیسا مومن کیسا کافر کون ہے صوفی کیسا رند
سارے بشر ہیں بندے حق کے سارے شر کے جھگڑے ہیں

دیکھ آئینے بہت بن خاک ہیں ناصاف سب — ہیں کہاں اہل صفا اہل صفا کہنے کو ہیں
سلسلہ وابستہ تھا کچھ عالم معنی سے ذوق — ورنہ تھیں یہ پتلیاں کب اپنے بس کی پتلیاں
عنقا کی طرح خلق سے عزلت گزیں ہوں میں — ہوں اس طرح جہاں میں کہ گویا نہیں ہوں میں
دانہ خرمن ہے ہمیں، قطرہ ہے دریا ہم کو — آئے ہے جز میں نظر کل کا تماشا ہم کو
ایک دم عمر طبیعی ہے یہاں مثل حباب — فکر امروز ہے نے ہے غم فردا ہم کو
ہے باغ جہاں میں تجھے گر ہمت عالی — کر گردن تسلیم کو خم اور زیادہ
لیتے ہیں ثمر شاخ ثمرور کو جھکا کر — جھکتے ہیں سخی وقت کرم اور زیادہ
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے جی لگے — پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

نہ دینا ہاتھ سے تم راستی، کہ عالم میں عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لیے

اوپر کے شعروں میں تصوف، اخلاقیات، بے ثباتی عالم، سخاوت اور صداقت جیسے مضامین کا ذکر ہے، لیکن اس ضمن میں عرض یہ کرنا ہے کہ ذوق کا اسلوب حیات اور ان کی شخصیت سازی کے رموز بھی انہی شعروں میں پنہاں ہیں۔ قارئین خوب سمجھتے ہیں کہ شاعری اور شخصیت یا افتاد طبع اور سخن وری کا کیا رشتہ ہوتا ہے، میں اس باب میں مزید کچھ وضاحت یا صراحت کرنے کو ضروری نہیں سمجھتا۔ سید عابد علی عابد نے بہت صحیح لکھا ہے:

> ''ذوق کے دیوان کا مطالعہ ذوق کی زندگی کے چوکھٹے میں رکھ کر کیا جاسکتا ہے۔'' (مقدمہ سید عابد علی عابد، ذوق سوانح اور انتقاد از علوی، ص 33)

> ''ذوق کی شاعری سے لطف اٹھانے کے لیے بے حد ضروری ہے کہ ذوق کے زمانے کی دہلی کی فضا اور ذوق کی شخصیت کا گہرا مطالعہ کیا جائے۔ دونوں غیر معمولی طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔'' (ایضاً، ص 36)

اب ذوق کی شاعری کا مطالعہ صنف غزل اور صنف قصیدہ کی روشنی میں پیش کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے چند رباعیات و قطعات بھی کہے ہیں، لہٰذا آخر میں ان اصناف سخن پر بھی سرسری روشنی ڈالی جائے گی۔

O

تنقیدی محاکمہ

غزل گوئی:

میر تقی میر کی غزل کے بعد 19 ویں صدی میں غالب کا نام سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ غالب کی جو شہرت اب ہے، عہد غالب میں قطعی نہیں تھی۔ اس وقت ذوق کا طوطی بولتا تھا۔ اسی زمانے میں مومن اور شیفتہ بھی تھے۔ ذوق چونکہ بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے اس لیے ان کا ستارہ بلند تھا۔ اُن کے شاگردوں کی تعداد بھی بہت تھی، جو ان کی شاعری کی تعریف و توصیف میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔

ذوق نے غزلیں اچھی خاصی تعداد میں کہیں۔ حالانکہ شہرت کے اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو انھیں آسمان ادب پر ایک قصیدہ گو کی حیثیت سے درخشندہ ستارے کی طرح دیکھا جاتا ہے۔ یہیں یہ بات عرض کی جاسکتی ہے کہ قصیدہ گوئی میں غالب ان سے بہت پیچھے ہیں۔ یہاں ذوق کی غزلیہ شاعری پر گفتگو ہورہی ہے۔ ذوق کی غزلوں میں اس عہد کے مروج موضوعات شاعری ملتے ہیں۔ کوئی اجتہادی رویہ نظر نہیں آتا۔ عشق، محبت، جنوں، موسم گل، موسم خزاں، گل و بلبل، غنچہ و گل، ساقی و رند، جام و سبو، شب فراق، باغباں، صیاد، شب غم، آہ و فغاں، ہجر و وصال، بے ثباتی عالم، چشم و ابرو اور دنیا سے بے رغبتی وغیرہ۔

میں نے ذوق کی غزلوں میں 'چشم' کو زیادہ برتا ہوا پایا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ چشم یا آنکھ ایک ایسا آلہ ہے جو حسن و عشق کے ساتھ ساتھ غم و نشاط کو بھی بہتر ڈھنگ سے پیش کرسکتی ہے۔ اس چشم کے بے شمار زاویے اور Associations ہو سکتے ہیں۔ مختلف النوع اسلامی پہلو پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ شاعر بھی 'چشم' کو یا آنکھ کو نئی نئی جہتوں میں پیش کرسکتا ہے اور اس کی بھی گنجائش ہوتی ہے کہ ایک ہی شعر میں پیش کی گئی چشم کی تعبیر و تشریح مختلف طریقوں سے کی جائے۔ بہتر ہوگا اگر ان میں سے چند اشعار پہلے یہاں پیش کردیے جائیں۔ تاکہ مختلف پہلوؤں اور جہتوں کی تفہیم و تعبیر میں دقت نہ ہو۔

تصور کس طرح بھولے ترے اس چشم گریاں کو   نکالے مینہ برستے میں کوئی کیا گھر سے مہماں کو

دشت کو سیراب کردے آبلہ پائی مری   ہر قدم پر چشمہ جاری چشم نقش پا سے ہو

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا   آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

چشم غضب ہے نیم نگہ میرے واسطے   اک نیمچہ ہے زہر میں گویا بجھا ہوا

وہ اپنی برش تیغ نظر کو دیکھتے ہیں   ہم ان کو دیکھتے ہیں اور جگر کو دیکھتے ہیں

تحریر سرمہ سے ہے تری چشم نیم باز   اے غیرت چمن در زنجیر باغ حسن

دیتی شربت ہے کسے زہر بھری آنکھ تری   عین احسان ہے وہ زہر بھی گر دیتی ہے

اے ذوق ہے غضب نگہ یار 'الحفیظ'   وہ کیا بچے کہ جس پہ یہ تیر قضا چلے

جگر اور دل کا جتنا حوصلہ تھا تُل گیا سارا   نگہ کے تیر کا ہونا ترازو اس کو کہتے ہیں

پہلے شعر میں ذوق نے 'تصور' کو مشخص (Persionify) کیا ہے جو دل میں ہے۔ اس تصور کو باہر نکالنا ایسا ہے جیسے کوئی مینہ برستے ہوئے عالم میں اپنے مہمان کو گھر سے نکال دے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں آبلہ پائی سے دشت کو سیراب کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ آبلہ گول ہوتا ہے اور اسی کی مناسبت سے ''چشم نقش پا'' کہا گیا ہے اور پھر چشمہ بھی دائرے کی شکل کا ہوتا ہے۔ نقش پا کی چشم سے چشمہ جاری ہونا بہت ہی مثبت رویے اور ایک نئے زاویۂ فکر سامنے لاتا ہے۔ رعایتوں اور مناسبتوں کی داد جس قدر دی جائے کم ہے۔ تیسرا شعر تو غضب کا ہے۔

آنکھ گرچہ چھوٹی ہوتی ہے لیکن اس کی بڑائی اس بات میں ہے کہ اللہ نے اس چھوٹی سی آنکھ میں آسمان کو منعکس کردیا ہے۔ دعوے اور دلیل دونوں مستحکم اور برجستہ ہیں۔ زبردستی کی دلیل قطعی نہیں۔ یہاں علامہ اقبال کی مشہور زمانہ نظم 'ساقی نامہ' کا یہ شعر بھی ملاحظہ کرلیجیے۔

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

یہاں خودی کی وسعت فلک کی وسعت کے برابر ہے۔ دل بھی چھوٹا ہوتا ہے جبکہ خودی کی وسعت بے کنار ہے، لیکن اقبال نے کہا کہ جب آنکھ کے تل میں فلک سما سکتا ہے تو دل میں خودی کیوں نہیں سما سکتی؟ اقبال نے ذوق سے استفادہ کیا، لیکن ایک قدم آگے بڑھ کر آنکھ کے بجائے آنکھ کے 'تل' کا استعمال کیا۔ اقبال اور ذوق کے مضامین کی کچھ مماثلتوں کا ذکر بعد میں آئے گا۔ آگے جو اشعار ہیں ان کی اپنی اپنی خوبیاں ہیں۔ نیم نگہ کو نیچہ کہنا، شربت کے بجائے آنکھ سے زہر کے ملنے کو عین احسان ('عین' آنکھ کو بھی کہتے ہیں) سمجھنا، چشم نیم باز میں تحریر سرمہ کو دو زنجیر باغ حسن، نگہ یار کو تیر قضا تصور کرنا شعری اظہار کے خوب صورت قرینے اور فنی شعور میں درک کو ظاہر کرتا ہے۔ آخری شعر میں نگہ کے تیر کا ترازو ہونا کہا گیا ہے، یعنی تیر کا اچوک ہونا۔ محبوب کے تیر نگاہ کا نشانہ کبھی چوکتا نہیں۔ دل اور جگر کے تمام حوصلے محبوب کی ایک ہی نظر میں نکل گئے یعنی خرچ ہوگئے۔ یہ شعر مضمون اور طرز ادا دونوں لحاظ سے خوب صورت اور لائق توجہ ہے۔

ذوق اس حوالے سے اپنے معاصرین میں بلند مقام پر ہیں۔ گرچہ یہ خوبیاں ظاہری اوصاف کو بتاتی ہیں جو انھیں اپنے استاد شاہ نصیر اور لکھنؤ کے مشہور شاعر ناسخ سے قریب کردیتے ہیں۔ شاہ نصیر کی تربیت نے انھیں جس لفظی اور ظاہری شعری حسن کے سجانے سنوارنے پر لگا دیا تھا، اس سے آخر دم تک وہ انحراف نہ کرسکے۔ کاش ذوق گہرے مشاہدات اور حسی تجربات کو بھی اس میں شامل کرلیتے۔

نالہ و فریاد یا آہ و فغاں بھی عاوی طور پر کلاسیکی شاعری کا ایک مضمون رہا ہے۔

اشک فشانی عاشق کا وطیرہ رہا ہے۔ اس حوالے سے بھی چند اشعار دیکھتے چلیں۔

دریائے اشک چشم سے جس آن بہہ گیا — سن لیجیو کہ عرش کا ایوان بہہ گیا

نالہ اس شور سے کیوں میرا دہائی دیتا — اے فلک گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہادیں — شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

اے گریہ نہ رکھ میرے تنِ خشک کو غرقاب — لکڑی کی طرح پانی میں گل جائے تو اچھا

نہ کرتا ضبط میں نالہ تو پھر ایسا دھواں ہوتا — کہ نیچے آسماں کے اور پیدا آسماں ہوتا

کروں اک نالے سے میں حشر میں برپا سو حشر — شورِ محشر مجھے سوتے سے جگائے تو سہی

ان شعروں میں الفاظ و تراکیب کی چستی اور بندش لائق توجہ ہے۔ اونچا سنائی دینا، محاورے کے طور پر کم سنائی دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دیکھیے کہ کس خوب صورتی سے ذوق نے اسے اوپر کے دوسرے شعر میں کھپایا ہے۔ اس شعر میں اگر غور کیجیے تو اندرون میں شاعر کا غصہ اور جھلاہٹ بھی شامل ہے۔ عام بول چال میں بھی کسی کی طرف سے بے توجہی ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اونچا سنتے ہو کیا؟ مذکورہ بالا شعروں میں کلام کی صفائی بھی ہے۔ وہ شعر دیکھیے جس کا دوسرا مصرع ہے ''کہ نیچے آسماں کے اور پیدا آسماں ہوتا'' نالہ کھینچنے کے سبب دھواں کی زیادتی ہوگی جس سے آسماں کے نیچے ایک اور آسماں بن جانے کا احساس ہوگا۔ اس میں مبالغہ ہے، مگر اس سے شعری حسن فزوں تر ہوگیا ہے۔ حالانکہ ذوق ثقیل الفاظ و تراکیب وضع کرنے اور مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ لیکن جہاں انھوں نے سادگی اور روزمرہ کی طرف توجہ کی ہے، اشعار نکھر گئے ہیں اور ان میں اثر پذیری، دل آویزی اور برجستگی پیدا ہوگئی ہے۔ یہاں ذوق کے شاگرد رشید محمد حسین آزاد کی ان کی غزلوں پر جو رائے ہے، ملاحظہ کیجیے۔

> ''غزلوں کے دیوان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ عام جوہر ان کے کلام کا تازگی مضمون، صفائی کلام، چستی ترکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے۔''
>
> (آبِ حیات، اتر پردیش اردو اکادمی، 1982؛ ص 451)

عام فہم اشعار وہی ہوتے ہیں جن میں غیر ضروری صنائع سے کام نہ لیا گیا ہو۔ مضمون

کی تازگی بھی ذوق کے یہاں ملتی ہے، لیکن جہاں استادی دکھائی گئی ہے مضمون کی تازگی بھی مجروح ہوگئی ہے۔ چوتھے شعر میں ذوق نے تن خشک کو لکڑی سے تشبیہ دی ہے، بلکہ تن خشک لکڑی کا کنایہ ہے۔ اس کے آگے کے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اگر میں اپنے نالے کو ضبط نہ کرتا تو اس آسمان کے نیچے کئی اور آسمان پیدا ہوجاتے۔ 'آسمان' بھی دھواں کے مانند ہے اور آہ و نالہ سے بھی ایک ایسی فضا کی تشکیل متصور ہے جو آسمان کے مثل ہے۔ اس طرح آپ دیکھیں کہ ذوق اپنی غزلوں میں کلاسکی رنگ کو کس طرح مشق و مزاولت سے مستحکم اور آبدار بناتے ہیں۔ زبان اور اس کے نکات سے ذوق کی گہری وابستگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ چند شعر اور ملاحظہ کیجیے جن میں روزمرہ اور محاوروں کو کھپایا گیا ہے۔

گل اُس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا — یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا — خوب طوطی بولتا ہے، ان دنوں صیاد کا

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو — زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

دن کٹا، جائیے اب رات کدھر کاٹنے کو — جب سے وہ پاس نہیں، دوڑے ہے گھر کاٹنے کو

رہ گیا اپنا سا منہ لے کے وہ آئینہ رو — تیری تصویر کو یوسف نے جو دیکھا لے کر

کہنے لگا کہ جاتا ہے پیاسا کنویں کے پاس — یا، جاتا ہے کنواں کہیں تشنہ دہن کے پاس

مؤذن مرحبا بروقت بولا — تری آواز مکّے اور مدینے

اس نوع کے بہت سے اشعار ہیں۔ ان شعروں میں لہو لگا کے شہیدوں میں ملنا، طوطی بولنا، زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھنا، گھر کا کاٹنے کو دوڑنا، اپنا سا منہ لے کے رہ جانا، پیاسے کا کنویں کے پاس جانا، تری آواز مکّے اور مدینے وغیرہ ایسے محاورے اور تراکیب ہیں جو روزمرہ کے بطور عام زندگی میں استعمال ہوتے ہیں۔ ذوق کو اس میں مہارت حاصل ہے کہ وہ تخلیقی طور پر انھیں اپنی غزلوں میں کھپا سکیں۔ ان کے ہم عصروں میں غالب کے یہاں بھی اس نوع کی مثالیں کم نظر آتی ہیں۔

ذوق کی شاعری کے یہی وہ اوصاف ہیں جن کی بنیاد پر اردو غزل کے مشہور شاعر فراق گورکھپوری نے لکھا تھا:

"ذوق کو استاد ذوق کہا جاتا ہے۔ اس خطاب کی موزونیت صرف اس لیے نہیں مسلم ہے کہ ذوق بادشاہ کے استاد تھے، بلکہ اس لیے بھی ہے کہ مختلف العنوان اشعار کہنے میں روزمرہ، محاوروں، کہاوتوں ایسے الفاظ اور فقروں کو جو بظاہر شعر میں کھپائے نہیں جاسکتے تھے بے لاگ باندھ جانے میں اور اس سب کو لے کر تعقیدوں کا کاوا کاٹتے ہوئے کچھ شہسواروں کی طرح یوں آگے بڑھ جانے میں کہ ہاتھ کا پانی تک نہ ہلے، ذوق اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یہی وہ قادرالکلامی ہے جس کی بدولت استاد کا لقب جتنا ذوق پر پھبتا ہے کسی اور پر نہیں پھبتا۔"

"ذوق کی شاعری دل کی شاعری ہے یا دماغ کی، اس کا جواب جو بھی ہو لیکن ذوق کی شاعری صناعی کی لاجواب مثال ہے۔ ذوق رائے عامہ کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پوپ کا یہ بیان مجھے یاد آجاتا ہے کہ فن کی تمام تر خوبی یہ ہے کہ زندگی کے مسلمات اور پنچایتی خیالات اور معتقدات کو حسین ترین طریقے پر ظاہر کردیا جائے۔" (انداز ے، ص 195)

اگر ذوق میں قادرالکلامی اور پختگی نہیں ہوتی تو شعری اظہار ایسے ہی، بالکل ازکار رفتہ ہوجاتا یا پھر لائق توجہ ہی نہ ہوتا۔ جہاں تک پوپ کی رائے پر صاد کرنے کا تعلق ہے، تو یہ ایک بحث طلب امر ہے کہ فن کی تمام تر خوبی زندگی کے مسلمات اور پنچایتی خیالات اور معتقدات کو حسین ترین طریقے پر پیش کرنا ہے۔ پنچایتی خیالات وضاحت طلب ہیں، اسی طرح زندگی کے مسلمات سے کیا مراد ہے یا پھر یہ کہ معتقدات کے زمرے میں پوپ کے یہاں کچھ آتا ہے اور ہمارے یہاں ہندوستانی تناظر میں اس کے ذیل میں کیا کیا امکانی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ البتہ روزمرہ اور محاوروں اور کہاوتوں کے استعمال سے ایک نوع کا پنچایتی طرز اظہار ضرور تشکیل پاتا ہے۔

پروفیسر محمد ذاکر کے مطابق:

"ان کی غزل میں روزمرہ و محاورے کے صحیح استعمال کی مثالیں خوش اسلوبی سے محفوظ ہو گئی ہیں... ان کے ہاں روزمرہ کا استعمال ہو یا محاورے کا، وہ بالقصد نہیں معلوم ہوتا، اس میں بے ساختگی کی شان ہے۔"
(شیخ محمد ابراہیم ذوق، مرتبہ: اسلم پرویز، انجمن ترقی اردو ہند، 1999، ص311-12)

محمد حسین آزاد نے ذوق کے متاثر ہونے کے حوالے سے میر، سودا، انشا، مصحفی، جرأت کا ذکر کیا لیکن ناسخ کا نہیں۔ جبکہ بقول شمس الرحمن فاروقی ناسخ ہی ذوق کی اصل ہیں۔ حالانکہ دیوان ذوق مرتب کرتے ہوئے ناسخ کا ذکر آیا ہے۔ فاروقی لکھتے ہیں:

"...اس بات میں کوئی کلام نہیں کہ ذوق کی غزل کی کلید ناسخ کی غزل میں ہے۔ مجموعی حیثیت سے ناسخ کا مرتبہ ذوق سے کچھ بلند ٹھہرتا ہے، لیکن ذوق کے یہاں ایک آزاد تنوع اور پربہار تجرباتی فضا ملتی ہے جو انھیں ناسخ سے ممتاز بھی کرتی ہے۔"
(شیخ محمد ابراہیم ذوق، انجمن ترقی اردو، مرتب اسلم پرویز، ص 299)

مجھے یہاں ذوق کا تقابل یا اس کے کلام پر شاہ نصیر یا ناسخ کے اثرات مرتب ہونے کا مطالعہ پیش کرنا نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ذوق کے کلام کی اپنی انفرادی پڑھت پیش کی جائے۔ میرا تو یہ ماننا ہے کہ ذوق نے جہاں بھی اساتذہ فن کی زباں دانی کے اثر سے خود کو قدرے آزاد کیا ہے، شعر کچھ اور نکھر کر سامنے آگیا ہے۔ خیال کی تازگی اور صفائی کے ساتھ ساتھ شاعری میں اثر انگیزی کی اہمیت بہت ہوتی ہے۔ لیکن یہ اثر انگیزی کی صفت بھی اسلوب اور طرزِ اظہار ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ خیال یا مضمون اگر فرسودہ بھی ہو، جب بھی بندش الفاظ کی چستی اور محاوروں اور روزمرہ کے سبب شعر میں اثر انگیزی بڑھ جاتی ہے۔ آیئے غالب اور ذوق کے دو دو شعر میں ذوق کی انفرادیت اور بندش الفاظ دیکھتے ہیں۔

میں، اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو، اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں — غالب

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں — ذوق

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خونفشاں کے لیے — غالب

نہ دل رہا نہ جگر، دونوں جل کے خاک ہوئے
رہا ہے سینے میں کیا چشم خوں فشاں کے لیے — ذوق

غالب کے شعر میں 'ایک وہ نشنیدن' نے پورے شعر کو ثقیل اور بوجھل بنا دیتا ہے۔ دوسری طرف ذوق نے اُسی مضمون کو بہت ہی صفائی اور فطری انداز میں پیش کر دیا ہے کہ بے چینی کے عالم میں یہاں ہونٹوں پر لاکھ لاکھ سخن ہیں اور اُدھر سب کے جواب میں محبوب کی محض خاموشی ہے۔ واقعی شعر میں دلکشی اور مضمون کی ادائیگی بہت ہی صاف طور پر ہوئی ہے جس کے سبب اثر انگیزی کی صفت پیدا ہوگئی ہے۔ دوسرے شعر میں بھی غالب نے مژۂ یار اور اپنے مژگاں خوں فشاں کا ذکر کیا ہے جس سے پورا شعر بوجھل سا ہوگیا ہے جبکہ ذوق نے بہت صفائی سے کہا ہے کہ دل اور جگر دونوں جل کے خاک ہوگئے۔ اب وہ سوال قائم کرتے ہیں کہ ایسی صورت حال میں آخر سینے میں کیا باقی رہ گیا؟ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ذوق زبان کے مزاج داں ہیں اور ساتھ ہی الفاظ و تراکیب کو شعروں میں فطری انداز میں کھپانے پر قدرت رکھتے ہیں۔ آخر کچھ تو بات ہوگی کہ ذوق کے زمانے میں غالب کی بہ نسبت ذوق کی محاوراتی اور نکل زبان کا شہرہ زیادہ تھا۔ پھر یہ کہ زبان سے کھیلنا اور رعایتوں اور مناسبتوں کا اہتمام ذوق کے یہاں خوب نظر آتا ہے۔ آیئے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

چنی تو نے افشاں جو اے مہ جبیں ہے — ستاروں میں کیا کیا چناں اور چنیں ہے
زیبا ہے روئے زرد پہ کیا اشک لالہ گوں — اپنی خزاں بہار کے موسم سے کم نہیں

سرخی پاں دیکھ لے زاہد جو دنداں پر ترے　　　　اٹھ کھڑا ہو ہاتھ سے تسبیح مرجاں چھوڑ کر
ریشِ سفید شیخ میں ہے ظلمت فریب　　　　اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمانِ صبح

پہلے شعر میں کہا گیا ہے کہ محبوب کی مانگ پر افشاں چنی گئی ہے جس کے سبب ستاروں میں چناں اور چنیں ہے، یعنی بحث کا موضوع بن گیا ہے۔ اس میں 'چناں اور چنیں' پہلے مصرعے کے چُنی کے ساتھ مل کر ایک عجیب و غریب لفظی وصوتی آہنگ پیدا کرتا ہے۔ ستاروں میں یہ بحث ہورہی ہے کہ محبوب کی مانگ میں جو افشاں ہے وہ یوں ہے تو یوں ہے۔ یعنی یہ کہ ذوق نے مضمون کی ندرت اور مناسبت شعر کو لائق تحسین بنا دیا ہے اور ساتھ ہی صوتی آہنگ سے ایک خاص رنگ بھی پیدا کیا ہے۔ دوسرے شعر میں ذوق نے خزاں کو بہار کے مساوی اس لیے قرار دیا ہے کہ عاشق جس کا چہرہ زرد ہے اس کی آنکھوں سے سرخ آنسو ٹپک رہے ہیں۔ سرخ آنسو کے قطرے گویا پھول کی طرح ہیں اس لیے یہاں اس کی توجیہ پیش کردی گئی اور المیہ پہلو میں طربیہ رنگ پیدا ہوگیا۔ ذوق نے یہاں تخلیقی ہنرمندی سے کام لیا ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر میں ذوق نے زردیٔ رخسار کو زرِ خالص کہا ہے اور اسی بنا پر عشق کو کیمیا قرار دیا ہے۔ وہ شعر ہے۔

نہیں ہے کم زرِ خالص سے زردیٔ رخسار
تم اپنے عشق کو اے ذوق کیمیا سمجھو

ذوق کا یہ ایک شعر ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ وہ کہاں کہاں سے مضمون ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔

دل شکستہ ہی رہا، بعدِ فنا بھی میں تو
کہ مری خاک سے بنتے ہی سبو، ٹوٹ گئے

عاشق چونکہ زندگی میں دل شکستہ رہا لہٰذا مرنے کے بعد جب وہ خاک میں مل گیا اور پھر اس خاک سے جب 'سبو' (جام، پیالہ) بنایا گیا تو وہ سبو بنتے ہی ٹوٹ گیا، کیونکہ اس کا مقدر ہی ٹوٹنا تھا کہ پوری زندگی عاشق دل شکستہ رہا تھا۔ 'بنتے ہی' سے اس شعر میں اور بھی شدت پیدا ہوگئی ہے بلکہ ایسے میں ایک عاشق کا المیہ کردار بھی ابھرتا ہے۔ دوسرے شعر میں جو پیکر تراشی ہے وہ بھی لائق توجہ ہے۔ عاشق کو ہمیشہ زرد رو (پیلے چہرے والا) ہی باندھا

جاتا ہے۔ پیلے چہرے پر سرخ اشک کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ زردی خزاں کی مناسبت سے اور بہار 'لالہ گوں' کی رعایت سے استعمال ہوا ہے۔ یہاں ذوق نے معنوی انسلاک پیدا کرنے میں پوری استادی دکھائی ہے۔

ذوق نے بڑی احتیاط کے ساتھ زندگی گزاری، وہ ایک خداترس انسان تھے۔ زندگی اور موت یا پھر فلسفۂ حیات پر ان کی نظر گہری تھی۔ حالانکہ وہ اپنی شاعری میں کوئی واضح فلسفۂ حیات پیش نہیں کرسکے تاہم جگہ جگہ ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں کوئی نہ کوئی پیغام یا زندگی کا رمز نظر آتا ہے۔ اس نوع کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

دیدۂ آبلۂ پا کا بھی رونا ہے — کہ نہ پہنچا ہو کہیں مجھ سے کسی خار کو رنج

ہمیشہ ہے مجھے سرمایۂ فنا میں بقا — حباب وار ہوں میں آب زندگانی میں

نہ طمطراق کو نے کرّ و فر کو دیکھتے ہیں — ہم آدمی کے صفات و سیر، کو دیکھتے ہیں

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

سب کو دنیا کی ہوس خوار لیے پھرتی ہے — کون پھرتا ہے، یہ مردار لیے پھرتی ہے

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے — زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات — ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے — پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کسی بے کس کو اے بیدادگر مارا تو کیا مارا — جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا — نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا — فرشتہ اُس کا ہم پایہ نہ پایا

مذکورہ بالا شعروں میں بڑے پیغام کا ذکر نہیں ہے بلکہ ذوق نے تخلیقی ہنرمندی سے کام لیا ہے۔ ان میں کہیں کہیں تو سہل ممتنع کا رنگ بھی پیدا ہوگیا ہے۔ جیسے: اب تو گھبرا کے یہ......، لائی حیات آئے...... ہنس کر گزار یا اسے...... وغیرہ۔ اس کے علاوہ ان شعروں میں داخلی کرب اور فنی رموز کی بُنت بھی ہے۔

'عشق' ایک ایسا مضمون رہا ہے جسے اردو شاعری کا مرکزی حوالہ کہا جاسکتا ہے۔ اسے کلاسک شعرا میں بالخصوص اور بعد کے شعرا میں بالعموم ہمیشہ برتا جاتا رہا ہے۔ ذوق نے بھی عشق اور اس کے تلازمے سے اپنی غزلوں کو منور کیا ہے۔ یہاں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

نہیں ہے کم زرِ خالص سے زردیِٔ رخسار — تم اپنے عشق کو اے ذوق کیمیا سمجھو

ذکر کیا جوشِ عشق میں اے ذوق — ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

مزا اتنا ہی ذوق افزوں ہو جتنے زخم افزوں ہوں — نہ کیوں ہم زخمِ تیغِ عشق کھائیں سر سے پاؤں تک

عشق کا جوش ہے جب تک کہ جوانی کے ہیں دن — یہ مرض کرتا ہے شدت انھی ایام میں خاص

گھر سے بھی واقف نہیں اُس کے کہ جس کے واسطے — بیٹھے ہیں گھر بار ہم سب خانہ ویراں چھوڑ کر

اے ذوق جا نہ ہوش و خرد کی صلاح پر — دے عشق جو صلاح وہی ہے بجا صلاح

دنیا گئی کہ عشق میں ایمان و دیں گیا — وہ مل گیا تو جانیے کچھ بھی نہیں گیا

آب دے اے گریہ میرے سینۂ سوزاں میں پھر — شعلۂ نارِ محبت مشتعل رہنے لگا

جب کیا عشق نے دریائے تلاطم اے ذوق — تو کہیں موج بنی اور کہیں گرداب بنا

جسے کہتے ہیں نارِ عشق اس کے دو کنارے ہیں — ازل نام اس کنارے کا ابد نام اُس کنارے کا

قیس و فرہاد کو بتلاؤں گا کچھ عشق کی راہ — اب کے میں گر طرفِ دشت و جبل جاؤں گا

میں یہاں ان اشعار کی تشریح و تعبیر پیش کر کے قارئین کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے یہ بات اس لیے بھی کہی کہ ذوق کے ان شعروں میں اظہار کی سادگی اور غیر پیچیدہ اسلوب ہے، لہٰذا کوئی ایسا پہلو نہیں جو رازِ سربستہ یا صیغۂ راز کی طرح ہو کہ جس کی تشریح یا جس کا تجزیہ پیش کرنا ضروری ہو۔

ہاں، اتنی بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ عشق جیسے مضمون کی پیش کش کے لیے جس دلِ گداختہ اور سوزشِ قلب و نظر کی ضرورت ہوتی ہے، اس کا یہاں فقدان نظر آتا ہے۔ ذوق غالب کی طرح اپنے فکر و فلسفے میں گہرائی بھی نہیں رکھتے تھے اور نہ حسن و عشق کے لیے ان کے باطن میں اضطرابی کیفیت کا وفور تھا، اور یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا اشعار میں مشکل سے تین چار

شعرا ایسے ہوں گے جو آپ کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچ لینے میں کامیاب ہوں گے۔ شعری حسن اور فنی رموز و نکات سے بہرہ مند ہونے کے بعد بھی ان میں وہ خوبی نہیں جو غالب یا دوسرے کئی شعرا کے یہاں نظر آتی ہے۔ لیکن ذوق نے پھر بھی، عشق کی کئی جہتوں اور پہلوؤں کو آشکار کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہاں ذوق نے جذبات انسانی کی پیش کش میں اپنی طرف سے کسی طرح کی کوتاہی نہیں کی ہے۔ یہ بھی نہیں کہ بلا وجہ لذت اور غیر ضروری Eroticism کے نقوش ابھارے جائیں، جیسا کہ بعض شعرائے غزل کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہاں اس نوع کی مثالوں کی گنجائش نہیں۔ ذوق کے یہاں عشق میں ایک طرح کی خود سپردگی بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ اس میں ایک طرح کی عظمت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ عشق میں موت کے مزے کا ذکر بھی کیا خوب ہے۔

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

اُس سنگ آستاں پہ جبینِ نیاز ہے وہ اپنی جانماز ہے اور یہ نماز ہے

عشق کے موضوع کو برتنے کا جہاں تک سوال ہے، اس حوالے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ذوق نے اس مضمون کو، پھر بھی پوری طرح نبھانے کی کوشش کی ہے۔ لطیف پیرائے میں عشقیہ مضامین پیش کرنے میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ تنویر احمد علوی نے لکھا ہے کہ:

> ''وہ کافر عشق نہ تھے۔ انھوں نے عشق کیا مگر عشق کو اپنا مذہب نہیں بنایا؛ ہاں ایک مہذب انسان کی طرح جذبۂ عشق کو اپنے دل میں جگہ دی اور اس کے گداز، کسک اور لگن کو وہ ہمیشہ اپنے سینے میں محسوس کرتے رہے۔''
>
> (ایضاً، ص 196)

علوی صاحب نے تو ذوق کے اعلیٰ عشقیہ مضمون کے ڈانڈے اقبال سے بھی جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ دھیمی دھیمی آنچ میں تپ کر ذوق کا تصور عشق بہت نکھر گیا اور اس میں تہذیب و انسانیت کا رنگ جھلک آیا، ساتھ ہی کہیں کہیں عشق حقیقی اور تصوف کے نقوش ذوق کے عشقیہ اشعار میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ دو تین شعر علوی صاحب کے منتخب

کردہ اور کچھ میر ے، ملاحظہ کیجیے تا کہ اردو غزل کے اس اہم مضمون سے ذوق کی دلچسپی کا اندازہ ہو جائے۔

کل ہم نے اس سے ترک ملاقات کی تو کیا پھر اس بغیر کل نہ پڑی دو گھڑی کے بعد
فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لیے یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لیے
جسے کہتے ہیں بحر عشق اس کے دو کنارے ہیں ازل نام اس کنارے کا ابد نام اس کنارے کا
دانہ خرمن ہے ہمیں، قطرہ ہے دریا ہم کو آئے ہے جز میں نظر کل کا تماشا ہم کو
کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈا پھر آخر دل ہی میں دیکھا بغل ہی میں سے تو نکلا

جز میں کل کا تماشا دیکھنا، عشق (حقیقی) کو اس تیرہ خاکداں (دنیا یا دل) کے لیے روشنی تصور کرنا، عشق کے دو کنارے یعنی ازل اور ابد کا ذکر کرنا ایک طرح سے عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کے سفر کو استعاراتی انداز میں پیش کرنے کی تخلیقی ہنرمندی ہے اور ساتھ ہی جواز کی فراہمی کا وسیلہ بھی۔ اسی طرح اوپر کے آخری شعر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خدا کی تلاش ادھر ادھر کرنا بے سود ہے کیونکہ اس کی اصل جگہ تو دل ہی ہے۔ میر نے بھی تو یہی کہا تھا۔

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں ہی دور تھا

یہی وہ طرز جستجو ہے جہاں سے شاعر مشرق علامہ اقبال کو 'فلسفۂ خودی' کی کرن ملتی ہے جسے فروغ بخشتے ہوئے وہ ایک شعلہ جوالہ کے روپ میں مبدّل کر دیتے ہیں۔ بہرحال، عرض یہ کرنا ہے کہ ذوق نے بھی عشق کے موضوع کو اپنی پوری تخلیقی قوت اور خلوص کے ساتھ اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔

محبوب کے لب و رخسار، زلف و گیسو، ناخن، کمر، دہن اور غنچہ دہنی جیسے مضامین ذوق کی غزلوں میں بھی ملتے ہیں بلکہ اہتمام کے ساتھ ملتے ہیں۔

مرا وہ گریہ غم، خندۂ عشرت سے بہتر ہے اگر آنسو مرے پونچھے وہ گل رخسار دامن سے
غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے ہنستے ہیں مگر تیری ہنسی کو نہیں پاتے

معلوم نہیں اس کے دہن ہے کہ نہیں ہے — اے ذوق ہم اس سرِ خفی کو نہیں پاتے
اُس روئے آتشیں کے تصور میں یادِ زلف — یعنی غضب ہے آگ لگے اور ہوا چلے
آتش رشک سے اس زلف معنبر کے نسیم — مشک بھی نافۂ آہو میں ہے جوں لو ہو گرم
ترا سنگار بھی ہے وہ بلا کہ جائے ٹھہر — پروئے زلف مسلسل کے تار تار میں دل
رہ گیا اپنا سا منہ لے کے وہ اے آئینہ رو — تیری تصویر کو یوسف نے جو دیکھا لے کر
خوں کا دریا مری آنکھوں سے بہا جاتا ہے — جب سے دیکھا ہے پری پیرہنِ سرخ ترا
لب نازک اس کا کیوں کر کہو یار حرف اٹھائے — کہ جو صدمۂ تبسم سے بھی ہے کبود ہوتا
کوئی کمر کو تری، کچھ جو ہو کمر تو کہے — کہ آدمی جو کہے بات سوچ کر تو کہے
ہے جی میں کہ غنچے کو کروں تنگ چمن میں — پھر یار کا ذکر دہنِ تنگ نکالوں

اس نوع کے اشعار کی کمی نہیں۔ ایسی شاعری میں خارجی عوامل و عناصر کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ یہاں جنسی تجربہ کم کم ہوتا ہے۔ یہاں جذبات انسانی یعنی غم و غصے، مسرت و شادمانی، ناکامی و نامرادی سے پیدا ہونے والے احساسات کی تلاش بیکار ہے۔ البتہ مذکورہ بالا شعر میں پہلا شعر: مراد گر یہ غم..... تیسرے شعر میں ذوق نے محبوب کے دہن (منھ) کو سرِ خفی (پوشیدہ راز) کہا ہے۔ اس کے بعد والے شعر میں محبوب کے روئے آتشیں (آگ جیسے چمکتے چہرے) کو عین آتش یا آب اور 'یادِ زلف' کو ہوا کے چلنے سے تشبیہ دی ہے، جو کہ ذوق کی فنی چابکدستی اور قادرالکلامی پر دال ہے۔ اس کے آگے جو شعر ہے اس میں ایک قدم اور آگے بڑھ کے یہ کہا گیا ہے کہ رشک کیا آگ (آتش رشک) ہرن کے نافے میں مشک لہو کی طرح گرم ہو کر پھرتا ہے۔ رشک و رقابت کے مضمون کو ذوق نے ذی روح میں مجسّم (Personify) کرنے کی فن کارانہ اور کامیاب کوشش کی ہے۔ اور شعر نمبر 8: خوں کا دریا مری..... میں شدت اظہار نے جذبات کو شامل کرلیا ہے۔

عشق اور محبت کا اظہار بھی جذبات انسانی کا ایک اہم پہلو ہے، چونکہ عشقیہ شاعری کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس پر دوبارہ سے بحث کرنا یا روشنی ڈالنا غیر ضروری ہے۔ آیئے جذبات انسانی کے دوسرے پہلوؤں کی نشاندہی کی جائے۔

دریائے اشک، چشم سے جس آن بہہ گیا — سن لیجیو کہ عرش کا ایوان بہہ گیا
روز کہتا تھا مزا مجھ کو چکھا دے عشق کا — بھر دیا لون اس نے دل کو چیر کر اچھا ہوا
خجل اپنے گناہوں سے ہوں میں یاں تک کہ جب میرا — تو جو آنسو مری آنکھوں سے نکلا سرخ رو نکلا
یعقوب کی طرح مری چشم پُر آب سے — تا زندگی ہوا نہ سر آستیں جدا
سرگرمی مضموں کا اگر رنگ نکالوں — میں ہوں کہ شرار از جگر سنگ نکالوں
ہوں میں وہ جگر خوں کہ مسامات بدن سے — جوں اشک عرق بھی شفقی رنگ نکالوں

یہاں جذبات آہستگی کے ساتھ مگر باطن میں ایک طرح کی گرمی لیے ہوئے، شعروں میں ڈھل گئے ہیں۔ پہلے اور دوسرے شعر میں جذبات کی شدت ہے اور اس کے طرزِ اظہار میں بھی قدرے شدت نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جذبات انسانی کے بھی کئی روپ ہوتے ہیں۔ الگ الگ موقع ومحل سے اس میں شدت یا ٹھہراؤ پیدا ہوتا رہتا ہے۔ پانچویں شعر میں جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ پہلے مصرعے میں بہت صاف اور واضح ہے لیکن دوسرے مصرعے میں الفاظ کے در و بست نے رواں شعر میں رکاوٹ پیدا کردی ہے۔ حالانکہ ذوق کہنا چاہتے ہیں کہ مضمون کی سرگرمی کو رنگ عطا کروں تو گویا وہ بھی پتھر سے نکلنے والی چنگاری کی طرح ہوگا۔ 'شرار از جگر سنگ' سے اس مصرعے میں ثقالت آگئی ہے لیکن شاید ذوق اپنی استادی سے کسی طرح سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل پر جگہ جگہ قصیدے کا اسلوب حاوی نظر آتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے الطاف حسین حالی نے لکھا ہے:

> ''ذوق کی غزل میں عموماً زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے، مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔''

(مقدمۂ شعر و شاعری، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 2003، ص 148)

چوتھے شعر میں تلمیح ہے اور اس میں ایک الیہ کردار خلق ہوگیا ہے۔ ذوق یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس طرح حضرت یعقوب پوری زندگی اپنے بیٹے حضرت یوسف کی یاد میں روتے رہے اور اپنی آستین سے آنسو پونچھتے رہے اسی طرح میری اشک آلود آنکھوں سے آستین

کبھی جدا نہیں ہوئی۔ گویا گریہ وزاری میں ہیشگی اور تسلسل قائم رہا۔ بہت ہی سادگی کے ساتھ ذوق نے اس مضمون کو باندھنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ذوق کی سادہ طبیعت اور منکسر المزاجی نے اُن کے جذبات کو بھی کبھی برانگیختہ نہیں ہونے دیا۔ یا یوں کہہ لیں کہ جذبے میں جس شدت کی ضرورت ہوتی ہے، اس میں بھی ذوق کے یہاں ٹھہراؤ، آہستہ روی اور سرد مہری کا رنگ نظر آتا ہے۔ ورنہ مضمون کی حد تک اگر دیکھا جائے تو ذوق اپنے عہد کے کسی بھی نمائندہ شاعر سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں تھے۔ جس کی توثیق حالی کے مذکورہ بالا بیان سے بھی ہوتی ہے۔ اسلوب میں بھی ان کے یہاں کوئی کوئی شعر یا کبھی کوئی پوری غزل سادگی اور پُرکاری کے ساتھ جہاں بندھ گئی ہے وہاں اس کا ایک الگ ہی رنگ ہے، ایک الگ ہی عالم ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے ۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
وقت پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
سنتے ہیں اس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم کس مزے سے عتاب کی باتیں
احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں
اسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر آرام میں ہے وہ جو تکلف نہیں کرتا
تو ہماری زندگی، پر زندگی کی کیا امید تو ہماری جان، لیکن کیا بھروسہ جان کا
لائی حیات آئے، قضا لے چلی، چلے اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

برجستگی اور تخلیقی ہنرمندی کے ساتھ ساتھ ان شعروں میں ذوق نے انسانی تجربے اور سچے جذبات کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ پہلے ہی شعر کو دیکھیے جس میں کہ بہت ہی عام سا مگر بالکل سامنے کا تجربہ پیش کیا گیا ہے۔ انسان جب بہت پریشان ہوتا ہے، مصائب اور دکھوں سے گزرتا ہے تو موت کو گلے لگا لینے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ یہاں انسان کے اس جذبے کو ذوق نے نشان زد کرتے ہوئے دوسرے مصرعے میں اس میلان پر قدغن بھی لگا دیا ہے اور اس کے لیے انھوں نے پہلے مصرعے میں کیے جانے والے اقدام پر سوالیہ

نشان قائم کردیا ہے کہ 'مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟' اس طرح دوسرے مصرعے میں اس سوچ کو پیش کیا ہے کہ بڑھاپے میں بہت سے لوگ اپنے ایام جوانی کو یاد کرتے ہیں، لیکن یہ عمل خواب دیکھنے جیسا ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں کہا کہ ایسا کرنا غلط ہے، محض اپنی ایک رائے دی ہے، اور خوب صورت انداز میں دی ہے۔

پانچویں شعر میں ذات مطلق کی تلاش ہو رہی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کا سراغ لگانا آسان نہیں۔ دوسرے مصرعے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر اُسے یعنی ذات مطلق کو پالیا تو پھر اپنا سراغ لگانا مشکل ہوگیا۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ خودی اور بے خودی کا سفر ہے۔ ذات مطلق تک رسائی حاصل کرنے کے لیے خود کو کھونا پڑتا ہے، اور یہ بھی کہ ذات مطلق بہ ہر تو کہیں ہے نہیں، مگر ہر جگہ ہے بھی۔ اس کے بعد والا شعر تو ضرب المثل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ بھی عام تجربے کا شعر ہے اور نہایت ہی صفائی اور سادگی کے ساتھ تجربہ شعر بن ا ہے اور آگے کے شعر میں محبوب کو زندگی اور جان کہا ہے اور ان دونوں کو بے ثبات بھی قرار دیا ہے کہ مان لیتے ہیں کہ تو ہماری زندگی ہے، لیکن چونکہ زندگی آخر کار فنا پذیر ہے اس لیے اس کی امید نہیں، اسی طرح تو ہماری جان ہے، لیکن یہ جان بھی ناپائیدار ہے اس لیے اس کا بھی کچھ بھروسہ نہیں۔ آخری شعر تو انسانی زندگی، قضا و قدر اور اس کائنات کے رشتے کو پیش کرتے ہوئے آدمی کی بے بسی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ سارے اشعار ذوق کے حسن تخلیق کو واضح کرتے ہیں۔

ابھی اوپر جیسا کہ کہا گیا کہ ذوق کی شاعری میں ضرب المثل بننے والی مثالیں ملتی ہیں۔ اس نوع کے چند شعر دیکھیے، البتہ اس نوع کے شعروں میں کچھ کے صرف ایک ایک مصرعے ہی مشہور ہوئے۔ ملاحظہ کیجیے۔

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات — ہنس کر گزار یا اُسے رو کر گزار دے

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا — کیا خوب آدمی تھا، خدا مغفرت کرے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

بجا کہے جسے عالم، اُسے بجا سمجھو — زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

اوپر پیش کیے گئے اشعار میں جو برجستگی اور بے ساختہ پن ہے، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُن میں تخلیقی ہنرمندی کس درجہ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ کلام کا معتد بہ حصہ اس خوبی سے معرّا ہے۔ لیکن یہاں ان اشعار میں رنگِ تغزل میں نکھار اور اسلوبِ اظہار میں روانی اور برجستگی ہے۔

ذوق کی غزل گوئی کے حوالے سے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے ایک مضمون تحریر کیا ہے جس میں ان کے پیش رو اور معاصرین کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ذوق پر کن شعرا کے اثرات کس کس طرح مرتب ہوئے ہیں، اس کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ:

> ''غزل میں ذوق کی بلند آہنگی خطابیہ اسلوب سے قریب ہوگئی، اور جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ غزل کو خطابیہ اسلوب سے کہیں زیادہ خودکلامی اور تحت البیانی راس آتی ہے۔ اس لیے ذوق کی غزل اپنے لہجے، اسلوب اور فنی رویے کے اعتبار سے زیادہ قابلِ توجہ قرار نہ پائی۔''
>
> (بحوالہ ذوق دہلوی ایک مطالعہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2000، ص 36)

حالانکہ آگے چل کر انھوں نے ان کی غزلوں میں مضمون آفرینی اور معاملہ بندی کی بات کرکے چند اشعار پیش کرتے ہوئے ان کی پذیرائی بھی کی ہے۔ لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عمل بسا اوقات تنافرِ معنوی کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے تو قاری کا ردِعمل بھی مثبت نہیں رہ پاتا۔ آگے چل کر انھوں نے لکھا ہے:

> ''ذوق کی غزل میں کہیں معاملہ بندی کی کوششیں ملتی ہیں اور اس کوشش میں وہ کبھی تعقیدِ لفظی، کبھی تنافرِ صوتی اور تعقیدِ معنوی کے شکار ہوتے ہیں اور ایسے شعروں کی تعداد وافر ہے۔'' (ایضاً،..........ص 37)

اسی مضمون میں آگے چل کر ان کی قادرالکلامی، زبان، روزمرہ اور محاوروں کے استعمال اور ان کے برتنے میں فنی چابکدستی سے کام لینے کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے چند اشعار بھی پیش کیے ہیں جو ذوق کے فنِ غزل گوئی کو مستحکم کرتے ہیں اور جہاں تک

تعقید کی بات ہے تو اس ضمن میں فراق کا موقف بھی ملاحظہ کر لیجیے:

> ''ان کے بہت سے اشعار میں تعقید ملے گی لیکن یہ تعقید مصرعوں کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہتے ہوئے پانی میں چکر یا بھنور پڑتے جارہے ہیں لیکن پانی کا بہاؤ نہیں رکتا... اس طرح ذوق کے یہاں بسااوقات عیب تعقید حسن تعقید بن جاتا ہے۔''
>
> (اندازے: ادارہ انیس اردو، 1959، ص192)

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خطابیہ اسلوب غزل کو ایک دم سے سطحی اور غیر توجہ طلب بنا دیتا ہے؟ ذوق کی غزلوں میں اگر خطابیہ اسلوب کا رنگ دکھائی دیتا ہے تو وہ قصیدہ نگاری کے عادی رجحان کے سبب۔ قصیدے میں جس طرح پرشکوہ اسلوب اور خطابیہ طرز ادا کی ضرورت ہوتی ہے، ذوق شاید اس کے حصار سے خود کو پوری طرح آزاد نہیں کر پائے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ اُن کی غزل میں اسلوب غزل کا یکسر فقدان ہے۔ یہ اشعار دیکھیے

وقت پیری شباب کی باتیں ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
سنتے ہیں اس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم کس مزے سے عتاب کی باتیں
لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
دیدۂ آبلۂ پا کا بھی رونا ہے کہ نہ پہنچا ہو کہیں مجھ سے کسی خار کو رنج

البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غزل میں خودکلامی بلکہ میں تو موضوعی (Subjective) ہونے کی بات کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ پوشیدگی اور Concealment بہتر ادب کا زیور ہے، لیکن ایسے میں اقبال کا تقریباً معتد بہ حصۂ شاعری (نظم سے قطع نظر) کس زمرے میں جائے گا جو سراسر خطابیہ اسلوب کے تحت آتا ہے۔ اقبال کے یہ چند شعر پیش کیے جاتے ہیں

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے
اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

اس زاویے سے بحث کی کافی گنجائش موجود ہیں۔ ذوق پر یا ان کی غزلوں پر بلند

آہنگی یا خطابیہ اسلوب (منفی معنی میں اگر ہے) کا الزام درست نہیں۔ جس شخص کے یہاں حد درجہ عاجزی اور انکساری کے عناصر ان کے مزاج کا حصہ ہوں، بھلا یہ اوصاف ان کے یہاں کہاں سے آسکتے ہیں؟ ہاں، تعقید لفظی و معنوی یا تنافر صوتی کی بات کی جا سکتی ہے اور یہ عیوب ایسے ہیں جو تقریباً تمام شعرا کے یہاں کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ متقدمین، متوسطین یا متاخرین یا معاصرین کی شاعری سے اس نوع کی مثالیں پیش کی جائیں۔ ذوق کو بہر حال اس بات میں درک حاصل تھا کہ لفظوں کے در و بست اور ان کی حدت و توانائی، ان کی نغمگی اور غنائیت کا وہ پورا پورا خیال رکھتے تھے، جس کا اعتراف بیشتر نقادوں نے کیا ہے۔ کلیم الدین احمد نے بھی ان کی مشاقی، زبان پر قدرت اور پختگی کا ذکر کیا ہے البتہ جذبات کی گرمی اور احساسات کی تازگی کے فقدان کا بھی ذکر ساتھ ساتھ کر دیا ہے، اور اس میں سچائی بھی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ذوق کو اخلاقی مضامین میں زیادہ دلچسپی ہے اور اس نوع کے اشعار پیش بھی کیے جا چکے ہیں۔ کلیم صاحب نے بھی وہی وطیرہ اختیار کیا ہے کہ بار بار وہ سودا، میر اور درد کے اشعار پیش کر کے ذوق کو کمتر ٹھہراتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ کلیم الدین احمد کو یہی کرنا چاہیے تھا جب کسی اردو کے شاعر کو کمتر ٹھہرانا ہوتا ہے تو فوراً بائرن، کیٹس، ایلیٹ اس کے مدمقابل آ کھڑے ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ طرز تنقید درست نہیں۔ جس شاعر کا متن ہے، اسی پر نظر مرکوز ہو تو بہتر ہے، ہاں تقابل کے لیے دوسرے شعرا بھی لائے جا سکتے ہیں لیکن تضحیک و تذلیل کے لیے نہیں۔

ابوالکلام قاسمی نے ذوق کی غزلوں میں پیکر تراشی کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کے فن کی داد بھی دی ہے۔ تلازمات لفظی اور بندش کی چستی کے لیے تحسین کے الفاظ بھی لکھے ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''تاہم یہ بات بھی درست ہے کہ وہ اپنے اچھے لمحوں میں اپنی تخلیقی شخصیت کے جوہر بھی دکھاتے ہیں اور کبھی کبھی استعارہ سازی اور متحرک حسی پیکروں کی تخلیق کرنے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔''

(بحوالہ: ذوق دہلوی ایک مطالعہ، 2000، ص 44)

سچی بات تو یہ ہے کہ تمثال نگاری یا پیکر تراشی کے بغیر شاعری میں جان نہیں پڑتی۔ بیشتر بڑے شعرا نے اس جانب خصوصیات کے ساتھ توجہ کی ہے۔

ذوق کے یہاں بھی مختلف النوع پیکر ابھرتے ہیں۔ اس پیکرسازی میں انھوں نے تمام تر تخلیقی ہنرمندی سے کام لیا ہے۔

سرد ہونے پہ بھی گرمی وفا ہے اس میں ... جا پڑا پاؤں پہ قاتل کے تڑپ کر کشتہ
اے غیرت چمن در زنجیر باغ حسن ... تحریر سرمہ سے ہے تری چشم نیم باز
اٹھ کھڑا ہو ہاتھ سے تسبیح مرجاں چھوڑ کر ... سرخی پاں دیکھ لے زاہد جو دنداں پر ترے
جب سے دیکھا ہے پری پیرہن سرخ ترا ... خوں کا دریا مری آنکھوں سے بہا جاتا ہے
خضر کو چشمۂ ظلمات کا دھوکا ہوتا ... دیکھتا چاہ ذقن کو جو تہہ سبزۂ خاک
میں نے جانا ماہ تاباں پارہ پارہ ہوگیا ... دانت یوں چمکے ہنسی میں رات اس مہ پارہ کے

ان شعروں میں پیکر تراشی، محاکاتی رنگ اور رعایتوں کے بہت ہی واضح نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔ ذوق نے اپنی غزلوں میں جو زور یا اثر پیدا کیا وہ بقول کلیم الدین احمد محض مشاقی کے سبب تھا۔ ایک سوال یہاں بھی پیدا ہوتا ہے کہ شاعری میں کیا مشاقی کی ضرورت نہیں یا پھر یہ کہ شاعری کے لیے مشاقی صرف ایک اضافی عمل ہے؟ اس کا جواب میری نظر میں تو اثبات ہی میں ہے، مگر کلیم صاحب نے ذوق کے دو شعر لکھ کر ان کی تعریف کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس سے تو اندازہ یہی ہوتا ہے کہ مشاقی یا قادرالکلامی محض ایک اضافی عمل ہے۔ پہلے شعر ہے:

کس وقت میرا منھ کو کلیجہ نہیں آتا ... کس دم نہیں گھٹتا مرا دم سینۂ غم سے
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا ... ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہائیں

اب وہ لکھتے ہیں:

> ''ان شعروں میں پہلے تین شعروں سے زیادہ زور ہے، زیادہ روانی ہے، شاید کچھ زیادہ اثر ہے لیکن یہ زور، یہ روانی، یہ اثر زور قلم کا نتیجہ ہے، مشاقی کا نتیجہ ہے، قادرالکلامی کا نتیجہ ہے؛ پرجوش جذبات کا نتیجہ نہیں۔ ہم

> دم گھٹتے نہیں دیکھتے، کلیجہ منہ کو آتے نہیں دیکھتے، رونے سے دریا بہتے ہوئے نہیں دیکھتے، یعنی یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ باتیں قرینے سے کی گئی ہیں۔ اثر ہے تو حسن بیان کا، حسن ہے تو لفظی۔"
>
> (اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ اوّل، موتی لال بناری داس، بانکی پور، پٹنہ، 1964، ص 166)

مجھے تو ان کی تنقید میں ذوق کے حوالے سے یہ پڑھتے ہوئے بے ساختہ ہنسی آ گئی کہ ان کے کلام میں وہ تمام خوبیاں جو نثر میں ہوتی ہیں موجود ہیں۔"

مسئلہ یہ ہے کہ جب آپ شاعری میں ہر چیز خواہ وہ مرئی ہو کہ غیر مرئی، مجرد ہو کہ غیر مجرد آپ اُسے اپنی آنکھ سے دیکھ لینے کے بعد ہی اس پر یقین کرنے کا من بنائے بیٹھے ہیں تو کیا کیا جائے؟ کلیم صاحب ذوق کے مذکورہ بالا شعر میں شعر کے راوی کا دم گھٹتے ہوئے نہیں دیکھتے اور نہ کلیجہ منہ کو آتے ہوئے دیکھتے ہیں اور یہ بھی کہ راوی کے رونے سے وہاں دریا بہنا شروع ہو جانا چاہیے، جبکہ ایسا قطعی نہیں ہوا، تو پھر یقین کیسے کر لیا جائے؟ یعنی یہاں بھی جذبات سرد ہیں۔ بقیہ کئی شعرا کے یہاں وہ ان جیسے مرئی و غیر مرئی اشیا و جذبات کو دیکھ لیتے ہیں۔ پہلے شعر میں تو یوں بھی "منھ کو کلیجہ آنا" محاورے کا استعمال اس خوب صورتی سے کیا گیا ہے کہ اس کی داد نہ دینا ادبی بددیانتی ہوگی جو کہ کلیم صاحب کو شاید نظر نہ آسکا۔ دوسرے شعر میں بھی محض مشاقی نہیں بلکہ باطنی کرب و غم کا ایک سیلاب ہے جو آنکھوں سے لڈا چلا آتا ہے۔

کلیم صاحب کو تو یہ شعر بھی شاید محض مشاقی کا نتیجہ معلوم ہوں گے۔

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا   اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
وقت پیری شباب کی باتیں   ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں

ایسے اشعار کو، زبان کی سادگی اور شیرینی کی داد نہ دینا اور 'مشاقی' کہہ کر رد کر دینا کسی طرح بھی درست نہیں۔ میں یہاں اپنی بات ختم کرنے سے پہلے سرسید کا قول نقل کروں گا، آپ کہیں گے وہ کون سے نقاد ہیں بھلا؟ میرا ماننا ہے کہ اردو زبان کو صحیح راستے پر لانے اور

شعر و ادب کو فروغ دینے میں ان کا جو کردار رہا ہے، اگر اُسے پیش نظر رکھا جائے تو تسلی ہو جائے گی۔ لکھتے ہیں:

> ''مشق سخن وری اس درجے کو پہنچی ہوئی ہے کہ کوئی بات اس صاحب سخن کی پیرایۂ وزن سے معرا نہ ہوگی۔ اس قدر جامعیت کہ فصاحتِ عبارت اور متانتِ تراکیب اور تازگیِ طرز اور جدتِ معنی اور غرابت تشبیہ اور حسن استعارہ اور خوش اسلوبی کنایہ اور لطف تلمیح اور پاکی الفاظ اور نمک ...زی کلمات اور نشستِ ردیف، نظم و نسقِ کلام اور حسنِ آغاز و انجام ایک جائے میں جمع ہے۔ متقدمین سے متاخرین تک کسی اور فرد کو حاصل نہیں ہوئی۔''
>
> (آثار الصنادید: سرسید، طبع اوّل، ص 216)

سرسید نے مذکورہ بالا اقتباس میں کلام ذوق کے حوالے سے جس قدر جامع اور خوبی کلام کے اجزا یعنی صنائع بدائع کا ذکر کیا ہے اس سے اردو کے نقادوں کو کلام ذوق کی قرأت اور اس کی تعیین قدر کے زاویے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ یہاں یہ بھی لائق توجہ ہے کہ سرسید نے کس خوب صورتی سے شعری اسلوب کی تشکیل اور ترکیب میں کام آنے والی تنی اصطلاحات کا ذکر کیا ہے، جیسے: فصاحتِ عبارت، متانتِ تراکیب، جدتِ معنی، غرابتِ تشبیہ، حسن استعارہ، نشست ردیف، نظم و نسق کلام، حسن آغاز و انجام، پاکی الفاظ وغیرہ۔ یہ لیجیے ذوق کو سنیے۔

آخر بگل اپنی خاک در میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

قصیدہ گوئی:

اردو شاعری کی تاریخ میں قصیدہ نگاروں کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جبکہ غزل گویوں کی تعداد اَن گنت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نمائندہ غزل گو کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں، البتہ قصیدہ نگاروں سے پھر بھی، بہت زیادہ ہے۔ ذوق کی غزلیہ شاعری کے بعد ان کی قصیدہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کا اندازہ ہوگا کہ وہ جہاں غزل میں اپنے

معاصرین میں بہت نمایاں نہیں، لیکن قصیدہ نگاری میں ان کے بھی ہم پلہ دوسرا کوئی نہیں۔ اس صنف میں وہ اپنے پیش رو مرزا محمد رفیع سودا کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس سے اس بات کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کا ڈکشن اور اسلوب قصیدہ نگاری کے لیے مناسب تھا اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس صنف قصیدہ نگاری میں اپنا فنی کمال دکھایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساری تخلیقی قوت گویا قصیدہ نگاری میں سمٹ آئی ہے۔

قصیدہ نگاری میں تشبیب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ شاعر اپنی تخلیقیت پوری طرح اس حصے میں لگا دیتا ہے۔ اس میں لفظوں کے انتخاب اور موسم کے تطابق سے ایک ایسی فضا بندی قائم کی جاتی ہے کہ قاری یا سامع سنتے ہی اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوجاتا ہے۔ سودا نے تو اس جز کو نبھانے میں کمال دکھایا ہی ہے، ذوق نے بھی اپنی استادی دکھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے — آیئے ایک قصیدے کے تشبیب سے یہ حصہ ملاحظہ کیجیے۔

واہ وا کیا معتدل ہے باغ عالم میں ہوا — مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا
بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار — بن گیا گلزار عالم رشک صد دارالشفا
ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہم زخم جگر — شاخ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا
ہو گیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق — لالہ بے داغ سیہ پانے لگا نشو و نما
ہوگیا زائل مزاج دہر سے یاں تک جنوں — بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا
ہوتا ہے لطف ہوا سے اس قدر پیدا لہو — برگ میں ہر نخل کی سرخی ہے جوں برگ حنا
کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم — کیا عجب گر آبِ حنظل دیوے شربت کا مزا
نسخے پر لکھنے نہیں پاتا 'ہوالشافی' طبیب — کہتا ہے بیمار 'بس کر مجھ کو بالکل ہے شفا'

باغ دنیا میں جو ہوا چلی ہے اس کے اثر سے موج صبا کی رفتار ایک صحت مند انسان کی نبض کی طرح اعتدال کے ساتھ چل رہی ہے۔ پہلے مصرعے میں معتدل اور دوسرے مصرع میں صاحبِ صحت کی نبض میں ایک طرح کی معنوی مناسبت پیدا کی گئی ہے۔ بہار میں جو ہوا چل رہی ہے اس کے سبب باغ دنیا ایسا بن گیا ہے جس پر سیکڑوں دارالشفا کو بھی رشک ہو۔ شبنم کا اثر پھولوں پر یوں ہوتا ہے جیسے زخم جگر پر مرہم کا اور کسی ٹوٹی ہوئی پھول کی ڈالی کے

لیے بارش کا قطرہ ایسا ہے جیسے مومیا۔ مومیائی حکمت میں ایک طریقۂ علاج ہے۔ مومیا موم کی طرح ایک نرم دوا ہوتی ہے جسے زخم یا چوٹ پر مرہم کی طرح لگاتے ہیں۔ آپ دیکھیں کہ 'شاخ شکستہ' کے لیے کس طرح 'مومیا' کا برمحل اور برجستہ استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح جنون اور مجنوں کی مناسبت سے بید مجنوں کا استعمال دیکھیے۔ دنیا کے مزاج سے جنون کی کیفیت اس طرح زائل ہوگئی کہ صحرا میں بید مجنوں تک نظر نہیں آتا۔ بید مجنوں ایک طرح کی نرم اور پتلی سی گھاس ہوتی ہے۔ مجنوں بھی جنون کے عالم میں بھوکا پیاسا، بتے رہتے پتلا دبلا ہوجاتا ہے پھر صحرا کی طرف نکل پڑتا ہے۔ صحرا بھی مجنوں کی مناسبت سے استعمال ہوا ہے۔ آگے جو شعر ہے اس میں یہ کہنے کی کوشش کی گئی ہے کہ 'لطف ہوا' یعنی ہوا کی لطافت کے سبب اس قدر لہو پیدا ہونے کا عمل شروع ہوا ہے کہ ہر ایک پودے کی پتیوں میں برگِ حنا کی سی سرخی پیدا ہوگئی ہے۔ ذوق نے مضمون میں ندرت پیدا کی ہے۔ زقوم یعنی تھوہر میں یعنی ایک زہریلا پودا جس میں جدوار یعنی زہر کاٹنے کی صلاحیت رکھنے والی بوٹی کا اثر پیدا ہوجائے تو اس میں حیرت کی بات نہیں، اس لیے کہ باغ عالم کی ہوا معتدل ہے۔ اسی طرح حنظل جو ایک کڑوی دوا ہے، اس کے پانی میں بھی اگر شربت کا مزا پیدا ہوجائے تو تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ذوق نے دو متضاد اشیا کی مدد سے معانی کی جہتیں پیدا کی ہیں۔ اسے بھی جوڑے دار ضدین یعنی Binary Opposition کی مثال سمجھنا چاہیے۔

اسی طرح آخری شعر میں دیکھیے کہ ماحول سازی اور فضا بندی کس خوب صورتی سے کی گئی ہے۔ طبیب نسخے پر جیسے ہی 'ہوالشافی' لکھتا ہے، بیمار کہہ اٹھتا ہے کہ اب مجھے شفا مل چکی، کچھ دوا تجویز کرنے کی ضرورت نہیں۔ گرچہ یہاں مبالغہ ہے جو غلو کی سرحد کو چھوتا ہے، لیکن ذوق کی تخلیقیت اور فن کاری نے اس میں فطری پن اور حقیقی رنگ پیدا کردیا ہے۔ ایک بات اور غور کرنے کی ہے کہ ذوق نے اس قصیدے میں جو بہاریہ تشبیب کے اشعار پیش کیے ہیں وہ محض زیب داستان کے لیے نہیں، بلکہ پورے قصیدے کا تعلق بادشاہ کی صحت یابی اور غسل صحت سے ہے۔ لہٰذا اسے مدح کا ناگزیر حصہ تصور کیا جانا چاہیے۔

ذوق نے اپنے قصائد میں مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات استعمال کی ہیں، آگے جن

کا ذکر آئے گا۔ ایک قصیدے کی تشبیب کا یہ خوب صورت حصہ دیکھیے جس میں موسم برسات اور اس سے پیدا ہونے والے حالات کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ چند شعر دیکھیے۔

ساون میں دیا پھر مہِ شوال دکھائی — برسات میں عید آئی، قدح کش کی بن آئی
کرتا ہے ہلال ابروئے پُرخم سے اشارہ — ساقی کو کہ بھر بادے سے، کشتیِ طلائی
کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشے میں — ساقی نے ہے آتش سے، مئے تیز اڑائی
یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے — ہووے نہ ممیّز کرۂ ناری و مائی
آرائشِ گُل کے لیے ہے جامۂ رنگیں — زیبائشِ غنچہ کے لیے تنگ قبائی
ابرو پہ کرے قوس قزح وسمہ تو خورشید — سرخیِ شفق سے، کرے ریش اپنی حنائی

ان شعروں میں آپ محسوس کریں گے کہ ذوق نے کس خوب صورتی سے فضا آفرینی کی ہے۔ دوسرے شعر میں ذوق نے ہلال، ابرو اور کشتی میں ہیئتی اعتبار سے ایک طرح کی مناسبت پیدا کی ہے۔ ہلال تو خود ہی خمیدہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لیے بطور صفت کے ابروئے پُرخم کا ذکر کیا گیا ہے۔ کشتی کی شکل ابرو اور ہلال کے مشابہ ہوتی ہے اور طلائی تو سونے کی رعایت سے استعمال ہوا ہے۔ ہلال جس وقت دکھائی دیتا ہے اس وقت سورج غروب ہونے کے بعد آسمان میں سنہری مائل سرخی چھائی رہتی ہے۔ پانچویں شعر میں بتایا گیا کہ پھول کی آرائش کے لیے جامۂ رنگیں اور غنچے کی زیبائش کے لیے تنگ قبا بہم ہے۔ حالانکہ پھول تو خود آرائش کے کام آتے ہیں اور کلیاں بھی زیبائش کے لیے ہوتی ہیں۔ مقصد صرف یہ کہنا ہے کہ باغ میں چاروں طرف پھول کھلے ہیں اور کلیاں تر و تازہ ہیں۔ غنچہ جب تک پھول نہیں بنتا گویا اس کی قبا تنگ ہوتی ہے۔ قبا کے کھلنے کا مطلب ہوتا ہے غنچے کا پھول بن جانا۔ آپ دیکھیے کہ ذوق نے کس اہتمام سے اس مضمون کو باندھا ہے۔ آخری شعر میں بھی کچھ ایسا ہی اہتمام نظر آتا ہے۔ ابرو پر قوس قزح وسمہ لگانے کا کام کرتا ہے یعنی رنگ چڑھاتا ہے تو سورج شفق کی سرخی سے اپنی داڑھی کو سرخ کرتا ہے۔ یہ داڑھی دراصل غروب آفتاب کے وقت پھوٹنے والی کرنیں ہیں جو کہ شفق کے سبب سرخ ہوتی ہیں۔ اسی طرح اگر قوس قزح کو دیکھیں تو اس کی شکل

بھی ابرو کے مماثل یعنی خمیدہ ہوتی ہے۔ یہاں ابرو اور داڑھی دونوں کی آرائش و زیبائش کے لیے رنگوں کا استعمال کیا جاتا ہے اور یہ کام ذوق نے فطرت سے لیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ذوق نے ہلال، قوس قزح اور سورج کو یہاں متحرک کردار کے طور پر لا کھڑا کیا ہے۔ اس شعری حصے سے ذوق نے پورے قصیدے کی فضا میں رونق افروزی کا کام کیا ہے جو کہ دلکش اور فطری ہے۔ لہٰذا ان کی قادرالکلامی اور تخلیقی ہنرمندی کے لیے کلمۂ تحسین بے ساختہ نکلتا ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں قصائد کا سرمایہ کم ملتا ہے۔ مولانا حالی نے بھی اس صنف کے حوالے سے کم نمونے دستیاب ہونے کا شکوہ کیا ہے لیکن سودا اور ذوق کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''اوّل سودا اور آخر ذوق صرف یہ دو شخص ہیں جنھوں نے ایران کے قصیدہ گویوں کی روش پر کم و بیش قصیدے لکھے ہیں اور جو حال قدیم سے چلی آتی تھی اس کو بہت خوبی سے نباہا ہے۔''

(مقدمہ شعر و شاعری، اترپردیش اردو اکادمی، 2003، ص 191)

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ذوق کو مختلف علوم و فنون سے شغف تھا اور انھوں نے اپنی شاعری میں اور بالخصوص قصائد میں ان کا استعمال بھی کیا، اگر ہم دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ علم ہیئت و نجوم، منطق و فلسفہ، فقہ و تفسیر، تصوف اور تاریخ، موسیقی اور طب وغیرہ ایسے علوم و فنون ہیں جن کی اصطلاحات ان کے قصائد میں کثرت سے ملتے ہیں۔ اول تو شعر میں ان اصطلاحات کو کھپانا ہی ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے، پھر یہ کہ ان کے استعمال کے بعد شعری حسن کا قائم رکھنا، یہ ایک اور بھی بڑا چیلنج ہو جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک مجھے اندازہ ہوا ہے، اس کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ چند ایک استثنائی مقامات کے علاوہ ذوق نے اپنے اس نوع کے قصائد شعریت اور شعری حسن دونوں کو قائم رکھا ہے۔ نجوم و ہیئت اور منطق کے حوالے سے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

حمل سے حوت تلک جا بہ جا ہیں تصویریں　　بنا ہے عالم بالا بھی عالم تصویر
ہوا ہے مدرسہ یہ بزم گاہِ عیش و نشاط　　کہ شمس بازغہ کی جا پڑھے ہیں 'بدر منیر'

اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ   نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر
نہ جاہ ترا وہ جسے تا دور فلک   نہ کسوف و نہ غروب و نہ ہبوط و نہ زوال
خانۂ قوس میں خورشید جہاں تاب آیا   دن ہیں کوتاہ ہوئے اور ہوئی رات طویل
کرتا ہے تری نذر سدا نقد سعادت   ہے مشتری چرخ کی کیا نیک کمائی

اوپر کے دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ جہاں میں چونکہ عیش و عشرت ہے اس لیے مدرسہ بھی بزم گاہ عیش و نشاط بن گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہاں 'شمس بازغہ' کی جگہ 'بدر منیر' پڑھائی جارہی ہے۔ شمس بازغہ جو کہ ملا محمود جونپوری کی عربی میں لکھی ہوئی ایک کتاب حکمت ہے جو کہ مشکل فن ہے اور دوسری طرف بدر منیر یعنی مثنوی 'سحرالبیان' میر حسن کی لکھی ہوئی مشہور مثنوی ہے جس میں عشق اور عیش و عشرت کی داستان ہے۔ اس کے آگے کے شعر میں بھی منطق کی اصطلاحیں صغریٰ اور کبریٰ استعمال ہوئی ہیں۔ منطق کا پہلا قضیہ صغریٰ اور دوسرا کبریٰ ہوتا ہے پھر نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ جیسے پہلا جملہ یا قضیہ کہ شیکسپیئر انسان ہے، دوسرا قضیہ انسان فانی ہے، جسے کبریٰ کہتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شیکسپیئر فانی ہے۔ پھر اسی صغریٰ اور کبریٰ سے نتیجہ نکالا کہ چھوٹے بڑے سب اس بادشاہ کے عہد میں خوش اور سرمست ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ پیالہ چھوٹا اور سبو بڑا ہوتا ہے۔ غور کیجیے کہ ایک مضمون کو ذوق نے علمی اعتبار سے کس درجہ مقام ارتفاع پر پہنچا دیا ہے۔

اس طرح صحت اور علم طب کے حوالے سے چند اصطلاحات دیکھیے۔

مومیائی ہو حمایت تری اس کے حق میں   سخت گیری سے فلک توڑے کسی کی گر آس
بوئی اکسیر کی اور پارس اگر ہاتھ آوے   بل بے ہمت ترے نزدیک یہ پتھر ہے وہ گھاس
نہ موج سے کو ہو پیچش نہ شیشہ سے ہچکی   گئی جہاں سے یہ بیماریٔ فواق و زحیر
نہ برق کو تپ لرزہ نہ ابر کو ہو زکام   نہ آب میں ہو رطوبت نہ خاک میں تبخیر

قصیدے میں کہا جاتا ہے کہ شوکت الفاظ اور پرشکوہ اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذوق نے ان باتوں کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ انھوں نے سودا کی پیروی کی اور بہت حد تک سودا کے مضامین اور اسلوب قصیدہ نگاری کو نبھانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن بہت سے ناقدوں نے

یہ بھی لکھا ہے کہ سودا کے مرتبے کو ذوق قطعی نہیں پہنچ سکے۔ اس بات میں سچائی بھی ہے۔ اس کا جو سبب ہے وہ یہ ہے کہ ذوق کے قصائد میں جو مضامین آئے ہیں ان میں تنوع نہیں ہے، جبکہ سودا کے قصائد میں مضامین کا بھی تنوع ہے اور اسالیب کا بھی۔ سودا نے ہجویہ قصائد لکھ کر بھی شہرت کمائی۔ ذوق چونکہ صرف بہادر شاہ ظفر کے دربار سے وابستہ رہے، اس لیے بھی ان کی فکر کا دائرہ تقریباً محدود رہا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سید امداد امام اثر نے یہ لکھا کہ ایک امر بہت قابل لحاظ ہے کہ ہر چند تقرب شاہی سے حضرت کی شاعری کو بڑا نقصان پہنچا مگر ان کے ذاتی معاملات اور اخلاق میں کوئی فساد واقع نہ ہوا۔

(کاشف الحقائق، ص 528)

سید امداد امام اثر نے سودا کو قصیدہ کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جو کہ سب مانتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذوق ہی کا کام تھا کہ سودا کی راہ میں قدم مار سکے۔ امداد امام اثر نے ذوق کے پانچ تشبیبوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں ان کے مشہور زمانہ قصیدے ''زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر'' اور ''ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی'' کا حوالہ نہیں ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے انتخاب میں بھی ڈنڈی ماری ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ دونوں قصیدے ذوق کے نمائندہ اور شعری لوازم سے بھرپور قصیدے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ذوق بحیثیت قصیدہ گو جہاں سے شروع ہوتا ہے وہیں انھوں نے بہت ہی سخت انداز میں اپنا موقف ظاہر کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''مرزا رفیع سودا کے بعد قصیدہ گوئی میں شیخ ابراہیم ذوق ہی کا نمبر ہے۔ مگر ان دونوں شاعران نامی میں پہاڑ اور ٹیلے کا فرق ہے۔ ذوق میں ایک ربع بھی سودا کی طبیعت داری نہیں ہے۔ سودا ایک نیچرل شاعر تھے ان کی فطرت نگاری کی ہوا بھی ذوق کو نہیں لگی تھی۔''
>
> (کاشف الحقائق، ترقی اردو بیورو، مرتب: وہاب اشرفی، 1982، ص 520)

مذکورہ بالا اقتباس میں جدید تنقید جیسی لفظیات دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ امداد امام اثر کا حالانکہ یہ اسلوب عام نہیں۔ مجھے تو اس میں پہاڑ اور ٹیلے کا فرق پڑھ کر بہت مزا آیا اور یہ

بھی کہ "...... ان کی فطرت نگاری کی ہوا بھی ذوق کو نہیں لگی تھی، اچھا تنقیدی جملہ ہے۔ اس نوع کے جملے کلیم الدین احمد کی تنقید میں بہت ملتے ہیں بلکہ ان کا تو عام اسلوب نقد ایسا ہی ہوتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سودا کا نام لے لے کر ذوق کے قصائد یا ان کے شعری اوصاف کو یکسر کالعدم قرار دینا چاہیے؟ میرے خیال سے یہ ایک ادبی بددیانتی اور یک رخا رویہ ہوگا کسی بھی ادب پارے کو پرکھنے کا۔ کسی بھی شاعر یا ادیب کی اپنی ایک انفرادی حیثیت بھی ہوتی ہے، چاہے وہ کسی کی تقلید اور پیروی ہی کیوں نہ کر رہا ہو۔ جہاں تک فطری شاعری کی بات ہے تو میں یہ عرض کروں گا کہ اس کا پیمانہ بھی ہر ایک قاری کا جداگانہ ہوسکتا ہے۔ میں صرف امداد امام کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ دوسرے ناقدین بھی، جو کہ ذوق کے قصیدوں میں فطری پن کے فقدان کی بات کرتے ہیں، ان کے حضور یہ چند شعر پیش کرنا چاہتا ہوں۔

زمیں پہ گرتے ہی لے آئے دانہ برگ وثمر
جو ٹوٹے ہاتھ سے زاہد کے سبحۂ تزویر

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابر سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی فیل مست بے زنجیر

رہا نہ کوئی گرفتار رنج عالم میں
چھٹے جو تیرے تصدق میں، مجرمان اسیر

وہ روشنی ترے خط میں کہ ابن مقلہ بھی
لگائے آنکھوں سے سرمے کی جا تری تحریر

تو ہو یہ نور بصارت کہ پڑھ لے حرف بہ حرف
جو ہووے لوح جبیں پر، نوشتۂ تقدیر

اردو شاعری میں زاہد کو ہمیشہ جھوٹا اور فریبی تصور کیا گیا ہے اسی مناسبت سے سبحۂ تزویر استعمال ہوا ہے۔ گرچہ جھوٹے اور فریبی زاہد کی تسبیح ہے لیکن ماحول اس قدر سازگار ہے کہ اگر اس تسبیح کے دانے زمین پر ٹوٹ کے گر جائیں تو وہاں بھی برگ وثمر اُگ آئیں، دوسرے شعر میں آسمان میں دوڑتے ہوئے ابر سیاہ کو بے زنجیر مست ہاتھی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ آگے یہ بھی ہے کہ جو مجرم قید و بندی زندگی گزار رہے تھے وہ سب تیرے صدقے میں رہا ہوگئے ہیں، اب دنیا میں کسی کو کوئی رنج اور دکھ نہیں۔ چوتھے شعر میں ذوق نے بادشاہ کی تحریر کو ابن مقلہ کی تحریر پر فوقیت دی ہے۔ ابن مقلہ عرب کا ایک مشہور و معروف خطاط گزرا ہے۔ کہا گیا کہ اگر ابن مقلہ سرمے کی جگہ تری تحریر اپنی آنکھوں میں لگا لے تو اس کی بصارت کچھ اتنی فزوں تر ہو جائے کہ وہ لوگوں کی پیشانی پر لکھی ہوئی تقدیر حرف بہ حرف پڑھ

لے۔ اس مبالغے میں غلو کے عناصر ہونے کے باوجود شعریت کسی طرح مجروح نہیں ہوئی ہے۔ ذوق نے اس نوع کے اشعار سے قصیدے کے لوازم اور اس کے عوامل کا پورا پاس رکھا ہے۔

یہ اشعار ایک ہی قصیدے سے ہیں۔ دو چند اشعار اور ملاحظہ کرکے آپ انصاف کرسکتے ہیں کہ ذوق کی شاعری ثقالت بھری ہے یا اس میں کچھ فطری رنگ بھی ہے۔

دی ہے مسجد میں موذن نے اذاں بہرِ نماز   باوضو ہوکے نمازی نے ہے باندھی نیت
خواب غفلت سے ہو بیدار کہ آئی پیری   نہیں مہتاب، یہ ہے روشنی صبحِ رحیل
شاہا ترے جلوے سے ہے یہ عید کو رونق   عالم نے تجھے دیکھ کے ہے عید منائی

بہرحال، یہاں نیچرل شاعری یا شاعری میں فطری پن کے حوالے سے بحث طویل کرنا مقصود نہیں۔ البتہ، اتنا ضرور عرض کیا جاسکتا ہے کہ اوپر جو اشعار پیش کیے گئے ان میں مجھے تو فطری پن کا وصف نظر آتا ہے، اور یہ بھی کہ قصیدہ میں 'قصد' شامل ہوتا ہے۔ لہٰذا، بہت زیادہ فطری پن کی جستجو بھی بے معنی ہے بلکہ شاعر پر جبر ہے۔ ذوق کی بدنصیبی رہی کہ غزل میں ان کے معاصرین میں سے غالب اور مومن ان کے مدمقابل کھڑے ہوگئے اور اس طرح ان کی شاعری تمام تر زبان کی باریکیوں سے اور بیان و بدیع سے متصف ہوتے ہوئے بھی دوسرے زمرے میں چلی گئی۔ دوسری طرف انھوں نے قصیدہ گوئی میں اپنے معاصرین کوتو مات دے دی لیکن اپنے پیش روقصیدہ گومحمد رفیع سودا سے مات کھاگئے۔ میرا معروضہ یہ ہے کہ ذوق پر ظلم نہیں ہونا چاہیے کہ غزل اور قصیدہ دونوں سے انھیں عاق کردیا جائے۔ ہمیں چاہیے کہ غزل یا قصیدہ کے جو بھی متون ہیں، انھیں معیار نقد پر ایماندارانہ پرکھنے کی کوشش کی جائے۔

اب میں ذوق کے قصائد میں اس وصف کی بات کرنا چاہتا ہوں جس میں انھوں نے قرآنی آیات، قرآنی فقرے، الفاظ وتراکیب یا علوم احادیث سے متعلق لفظیات استعمال کی ہیں۔ چونکہ وہ مذہبی تعلیمات اور روایات سے پوری طرح متصف اور باخبر تھے اس لیے، ان سے متعلق جا بہ جا موقع ومحل کے لحاظ سے الفاظ وتراکیب استعمال کرنے میں انھیں کوئی تردد یا الجھن نہیں ہوتی۔ آیئے اس نوع کے کچھ اشعار دیکھتے ہیں۔

تیرے احساں سے ہر انساں ہے غلامی میں تری — سچ کہا ہے 'الانسان عبید الاحسان'
نور افزا ہے بصارت، ہو اگر تیرا جمال — آئیں آنکھوں سے نظر معنی 'اللّٰہ جمیل'
روئے نیکو پہ ہے مائل تری خوئے نیکو — کہوں کیوں کر نہ کہ 'المحسن والی المحسن یمیل'
فتنے کو امن کہتا ہے تیرا کہ 'لا تقم' — عالم کو حفظ کہتا ہے تیرا کہ 'لا تخف'
تیرا دل صفا دم ایقان و معرفت — آگاہ رمز 'لو کشف و سرّ من عرف'
شہنشہا وہ تری روشنی رائے منیر — عقول عشرہ کے انوار جس کے عشر عشیر
جو ہو نہ تابع امر 'تشاورِ فی الامر' — تو عقل کل کو کرے تو نہ ہرگز اپنا مشیر
مصحف رخ ترا اے سایۂ ربّ العزت — کھول دے معنی 'اتممتُ علیکم نعمت'

اوپر کے اشعار میں 'الانسان عبیدالاحسان، اللّٰہ جمیل (اللّٰہ جمیل ویحب الجمال کی طرف اشارہ ہے)، المحسن والی احسن یمیل، لا تقم، لا تخف، لو کشف و سرّ من عرف، تشاورِ فی الامر، اتممت علیکم نعمت ایسے فقرے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ذوق کے زنبیل فرہنگ وادبیات میں عربی اور قرآنی علوم وآیات سے اکتساب کردہ مثالیں اور نقوش خوب ملتے ہیں۔ یہ چیزیں آپ کو غالب کے یہاں نہیں ملیں گی، بلکہ سودا کے یہاں بھی کم ہیں، اگر ان کے قصائد کی تعداد کا تناسب پیش نظر رکھیں۔ سودا کو دراصل ان کے مضامین کے تنوع اور بوقلمونی نے عظیم قصیدہ نگار بنایا۔ انھوں نے حکیمانہ اور اخلاقی مضامین سے لے کر حضرت علی اور بزرگان دین کی شان میں قصائد پیش کیے۔ ان کی تشبیبوں میں بھی رنگارنگی ہے۔ پھر یہ بھی کہ سودا نے ہجویہ قصائد بھی کہے جس کے سبب ان کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ لیکن ذوق کا مزاج انکساری اور عاجزی والا تھا، وہ کسی کو دکھ پہنچانا نہیں چاہتے یا کسی کی دل آزاری نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہجوگوئی کی طرف قدم بالکل نہیں بڑھایا۔ لیکن اگر آپ اُن کے قصائد میں علمی وقار دیکھنا چاہیں تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اسے نبھانے میں اپنا فکری وعلمی سرمایہ پوری تخلیقیت کے ساتھ صرف کر دیا ہے۔ ڈاکٹر ابومحمد سحر نے بہت درست کہا ہے کہ:

"علمیت اور معنی آفرینی میں ذوق کے قصائد خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

علمیت کی کارفرمائی اُن کے قصائد میں سودا سے زیادہ ہے... ان قصائد
کے علاوہ ان کے دوسرے قصائد میں بھی عالمانہ گہرائی، متانت اور سنجیدگی
پائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی علمیت کی شگفتہ زد کو انھوں نے مضمون آفرینی،
مبالغہ آرائی، حسن تعلیل، تلمیح و تمثیل، تشبیہ و استعارہ، الفاظ و تراکیب غرض
کہ خیال و بیان کے تمام پہلوؤں میں بڑی خوبی سے سمو دیا ہے۔"

(اردو میں قصیدہ نگاری: ابو محمد سحر، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، 2000، ص150)

دیوان ذوق (یکم مارچ 1957) کے ایک مرتب انوارالحسن صدیقی استاد ادبیات،
اسلامیہ کالج، لکھنؤ نے بھی لکھا ہے کہ:

"ان کے قصائد پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر سودا آسمان قصیدہ
کے آفتاب نصف النہار ہیں تو ذوق اسی آسمان کے ماہ کامل ہیں۔"

(دیوان ذوق، نول کشور بکڈپو، لکھنؤ، 1957، ص 14)

قصیدہ گوئی میں جس طرح کا پرشکوہ اسلوب درکار ہوتا ہے، اس کی پاسداری ذوق
کے یہاں خوب ملتی ہے اور مستحکم انداز میں ملتی ہے۔ اسی طرح استادی دکھانے کے لیے جیسی
سخت زمینیں اور قوافی یا ردیفوں کا انتخاب کیا جاتا ہے، ذوق اس میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔
اچھا قصیدہ اور وہ بھی سخت زمینوں میں قصائد کہنا ایک قادرالکلام شاعر ہی کا کام ہے۔ اس
محاذ پر بھی ذوق کھرے اترتے ہیں۔ آیئے اس نوع کے کچھ نمونے دیکھتے ہیں۔

اُس قد کو کیونکہ کہیے نہال چمن کی شاخ　　لائے گی وہ کہاں سے ادا بانکپن کی شاخ
بد خصلتوں کو کرتا ہے بالا نشیں فلک　　اونچی ہے آشیانہ زاغ و زغن کی شاخ

———

ابر رحمت کا ہے سایہ ترا اے سایۂ حق　　کیوں کہ سائے میں ترے ہو نہ جہاں کو رونق
قطرہ افشاں ہو اگر تیرا سحاب ہمت　　بوئی اکسیر کی پیدا ہو بجائے عرق
مشتری بھی ترے شطرنج کا ہے اک مہرہ　　آفتاب، ایک ترے گنجفے کا گر ہے ورق

———

روکش ہو تیرے رخ سے کیا نورِ سحر رنگِ شفق　　ذرہ ہے تیرے فیض کا، نورِ سحر رنگِ شفق
جس پر کہ تو ہوے غضب،ہواس کے حق میں کیا غضب　　سیلِ فنا، برقِ بلا، نورِ سحر رنگِ شفق

شاہا ترے حضور میں خواہانِ صد شرف　　گر عید یک طرف ہے تو نو روز یک طرف
تو باعثِ تفاخرِ شاہانِ روزگار　　تو وجہِ اعتبارِ سلاطینِ باسَلَف

ہڈیاں ہیں اس تن لاغر میں خس کی تیلیاں　　تیلیاں بھی وہ، جو ہو دیں سو برس کی تیلیاں
جوشِ گریہ میں ہوا یہ استخوانِ تن کا حال　　جس طرح گل جاتی ہیں، پانی میں خس کی تیلیاں

آخر کے دو شعروں پر غور کیجیے کہ کس خوب صورتی سے بڑھاپے اور لاغری کو پیش کیا گیا ہے۔ بتایا کہ اس کمزور جسم میں جو ہڈیاں ہیں وہ خس (ایک طرح کی گھاس) کی تیلیوں (ڈنٹھل) کے مشابہ ہیں۔ اور پھر یہ بھی کہا گیا کہ یہ تیلیاں بھی سو برس کی ہیں۔ مقصود ہے ناپائیداری واضح کرنا۔ آگے کے شعر میں بتایا کہ روتے روتے اور گریہ وزاری کرتے کرتے جسم کی ہڈیاں اس طرح گل گئی ہیں جس طرح پانی میں پڑی پڑی خس کی تیلیاں گل جاتی ہیں۔ اس پورے قصیدے میں ذوق نے جس طرح سے 'تیلیاں' ردیف کو نبھایا ہے، وہ ہر ایک کے بس کا نہیں۔ لہٰذا، ہم دیکھتے ہیں کہ قصیدہ نگاری میں ذوق اپنی قادرالکلامی اور استادی دکھانے میں کسی سے بھی پیچھے نہیں رہتے۔

اس طرح کے نمونے اور بھی پیش کیے جاسکتے ہیں، لیکن مقصد یہاں، صرف یہ ہے کہ قارئین اور اردو کے ناقدین ذرا توقف فرما کر انصاف کریں کہ زبان دانی، قادرالکلامی، ندرت مضامین، محاورہ بندی، غرض کہ رموز شاعری کے کس جُز میں ذوق کسی سے پیچھے رہ گئے ہیں؟ کیا یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ فن قصیدہ گوئی میں وہ کم از کم زبان اور اسلوب کی حد تک سودا کے ہم پایہ تو ضرور ہیں۔ مضامین میں سودا کی طرح تنوع نہیں، اور اس کے بھی بہت واضح اسباب رہے ہیں جس کی طرف اوپر اشارے بھی کیے گئے ہیں۔ ذوق کی افتادِ طبع اور تربیت ایسی نہیں تھی کہ مختلف النوع مضامین کی طرف دوڑ کر جائیں۔ ان کی شخصیت حددرجہ کسرِ نفسی اور

مرنجان مرنج والی تھی جس کے اثرات ان کی شاعری پر بھی بلاشبہ مرتب ہوئے لیکن، ایسا بھی نہیں کہ ان کی شاعری یکسر بے مزا اور بے وقعت ہے۔ اگر کسی کو ایسا لگتا بھی ہے تو صرف اس لیے کہ قصیدے میں سودا اور غزل میں غالب ذوق کے مدِ مقابل کھڑے کر دیے جاتے ہیں۔ اس رویے سے کام لینے کے بجائے انفرادی طور پر صرف ذوق کی غزلیہ شاعری اور ان کے قصائد کی قرأت اور بازقرأت کی جانی چاہیے۔ اگر اس طرح ذوق کا مطالعہ کیا جائے تو شاید ذوق فہمی کے نئے باب کھل سکتے ہیں۔

پروفیسر عبدالحق نے 'قصائد ذوق کی تفہیم' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں ذوق کو ہر طرح سے دوسرے تیسرے درجے کے شاعر کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انھوں نے مضمون میں جو جو تناظر خلق کیا ہے اور اس تناظر میں جس طرح ذوق کو رکھ کر دیکھنے پرکھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی ہے، میرے خیال سے وہ بہت مستحسن نہیں۔ پھر یہ بھی کہ وہ جو باتیں بھی کہتے ہیں، ان کے ذیل میں مثالیں پیش نہیں کرتے۔ یہ رویہ متون کی قرأت اور نقدِ شعر کا بہت صحیح طریقہ نہیں ہوسکتا۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ ہوائی اور خلائی تنقید ہوتی ہے، جس میں محض دعوے ہوتے ہیں دلائل نہیں۔ آیئے ان کے ایک دو اقتباسات دیکھیے:

> "ذوق اس دور حیثیت کے سب سے کمزور زاویے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ غزل میں معاصرین سے پیچھے ہیں۔ قصیدہ میں کچھ دور تک ساتھ دیتے ہیں۔"
>
> (ذوق دہلوی ایک مطالعہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، 2000، ص 48)

> "...ہاں وہ اپنے قصائد کی بنیاد پر ادبی تاریخ میں قابل قدر رہیں گے۔ تقابل کے طور پر نہ سہی مگر اس فن میں بھی وہ سودا، غالب و مومن کے ہم روش نہیں۔" (ایضاً، ص 49)

> "قصیدہ جلال و جبروت کے بلند آہنگ اور پُرشکوہ اظہار کا فن ہے۔"
>
> (ایضاً، ص 49)

مذکورہ بالا فرمودات کی روشنی میں کہہ سکتے ہیں کہ ذوق غالب اور مومن سے غزل گوئی میں پیچھے ہیں، لیکن یہ کہنا کہ قصیدہ میں کچھ دور تک ساتھ دیتے ہیں، ایک طرح کی ادبی ناانصافی ہوگی۔ آج امتداد زمانہ کے بعد یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ اردو قصیدے میں سودا کے ہم پلہ نہیں تو اُن کے بعد ذوق ہی کا مقام ہے۔ یہ کہہ سکتے تھے کہ مومن اور غالب قصیدے میں ذوق کا کچھ دور تک ساتھ دیتے ہیں۔ دوسرے اقتباس میں بھی کچھ یہی رویہ نظر آتا ہے جہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ "مگر اس فن میں بھی وہ سودا، غالب و مومن کے ہم روش نہیں۔" اب تو تثلیث کے بجائے مربع کا ذکر ہوا ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ سودا اور غالب یا مومن کو چھوڑ کر انفرادی طور پر ذوق کے متون کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔ ورنہ ذوق کے ساتھ ہمیشہ ناانصافی ہوتی رہے گی۔

قصیدہ نگاری میں بھی ذوق کے مومن اور غالب کے ہم روش نہیں ہونے کی بات شاید عبدالحق صاحب نے اپنے استاد محمود الٰہی صاحب کی پیروی میں کہی ہے۔ محمود الٰہی صاحب نے لکھا ہے کہ:

> "ذوق اردو کے عظیم قصیدہ نگار ہیں مگر مومن و غالب کے مقابلے میں
> قصیدہ نگاری میں بھی ان کا مقام بلند نہیں۔"

(اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی 1973، ص 324)

عبدالحق صاحب نے آخری اقتباس میں بلند آہنگی اور پُرشکوہ اظہار فن کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس اسلوب اظہار سے بھی ذوق تہی دامن نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ان کی افتادِ طبع میں عاجزی و انکساری جیسی ہی مثبت قدروں کا ذکر کیا ہے جس میں بالکلیہ صداقت ہے اور یہ بھی کہ یہ قدریں مدح گستری کے منافی ہیں۔ انھوں نے صرف بادشاہ وقت کی مدح سرائی کی جو کہ ان کے لیے مجبوری تھی اور یہ بھی کہ یہ انسانی نفسیات کا حصہ ہے۔ عبدالحق صاحب نے یہ بات بالکل درست لکھی ہے کہ سبب جو بھی ہو ذوق جیسے مذہبی معتقدات رکھنے والے انسان کے فن میں اس عنوان (نعت ومنقبت) کی عدم موجودگی پر حیرت ہوتی ہے۔ (ص 58)

سب باتیں اپنی جگہ، لیکن ذوق کے قصائد میں جلال و جبروت کے بلند آہنگ اور پرشکوہ اظہار کا فن نظر آتا ہے۔ قصیدے کے کچھ اشعار پہلے آچکے ہیں لیکن چونکہ عبدالحق صاحب نے ذوق کے مزاج کو اس اسلوب کے منافی گردانا ہے اس لیے قارئین کی خدمت میں اس نوع کے چند شعر پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک قصیدہ مطلع رابع تک ہے جس میں ایک سو ستر (170) اشعار ہیں۔ عبدالحق صاحب نے لکھا ہے کہ تعلّی عجز بیان میں تبدیل ہوتی ہے تو شخصیت کا قندیل ٹمٹمانے لگتا ہے۔ (ص 49)

صرف اسی قصیدے میں کم و بیش چالیس اشعار میں مختلف علوم و فنون میں درک رکھنے یا اُن کے حصول کی بات کی گئی ہے جس سے ان کی مختلف الجہات علمی، ادبی اور مذہبی شخصیت کے مستحکم ہونے کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ یہاں اسی قصیدے سے چار پانچ شعر اور دوسرے قصائد سے چند منتخب اشعار پیش کیے جاتے ہیں تا کہ ان کے پرشکوہ اسلوب شعری کا اندازہ ہو سکے اور اس کی تردید بھی ہو سکے کہ "ان کی شخصیت کا قندیل ٹمٹمانے لگتا ہے۔"

شب کو میں اپنے سربسترِ خوابِ راحت — نشۂ علم میں سرمستِ غرور و نخوت
کبھی میں کرتا تھا تصریحِ معانی و بیان — کبھی میں کرتا تھا توضیحِ نجوم و ہیئت
کبھی تھا علم الٰہی کی طرف ذہن رسا — کبھی کرتی تھی طبیعی میں طبیعت جودت
کبھی میں لون سے بینندۂ بیمار و صحیح — کبھی میں نبض سے دانندۂ ضعف و قوت
کبھی تھا علم قیافہ میں یہ ادراک مجھے — ایک صورت سے بیاں کرتا تھا میں سو سیرت
سیمیا سے کبھی تصویر کشِ موہومات — کیمیا سے کبھی میں زرکشِ گنجِ دولت

آج وہ دن ہے کہ اے خسروِ والا گوہر — کوہ دے نذر تجھے لعل، تو دریا گوہر
پرورش دیوے چمن کو جو ترا ابرِ کرم — موتیا میں، عوضِ غنچہ ہو پیدا گوہر

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر — عیاں ہو خامے سے، تحریرِ نغمہ، جائے سریر
ظہورِ نرگس و گل جلوۂ سمیع و بصیر — نسیم و نکہتِ گل، مظہرِ لطیف و خبیر

کہ چوب گُل کو اگر ماریں بید مجنوں پر تو صورتِ بشر ہوش مند، خوش تقریر

مثالوں کی کمی نہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ذوق کے قصائد کو غیر جانب داری اور ایمانداری کے ساتھ دیکھا، پڑھا اور پرکھا جائے۔ ورنہ وہی بات کہی اور دہرائی جاتی رہے گی کہ قصیدے میں سودا بڑا اور غزل میں غالب، قصہ تمام۔ ادب کی قرأت اور تفہیم کا یہ رویہ سراسر معاندانہ لگتا ہے۔

اوپر جو اشعار پیش کیے گئے، ان میں سب سے پہلے جو اشعار ہیں ''شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت'' اس کے حوالے سے ڈاکٹر تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

> ''لیکن اس دور میں انھوں نے اپنا وہ معرکتہ الآرا قصیدہ 'شب کو میں اپنے سربستر خواب راحت' لکھا جسے نہ صرف ان کے قصائد میں بلکہ اردو قصیدہ نگاری کی تاریخ میں مصطلحات مختلفہ اور مسائل علمیہ کے اظہار کے لیے حرف آخر کہا جاسکتا ہے۔''

(ذوق سوانح اور انتقاد: مجلس ترقی ادب، لاہور، دسمبر 1963، ص 231)

اس قصیدے کے حوالے سے محمود الٰہی صاحب نے بھی لکھا ہے کہ مختلف علوم و فنون کی مصطلحات کا اتنا مرصع اور کامیاب خاکہ اردو کے کسی شاعر نے پیش نہیں کیا۔''

(اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، مکتبہ جامعہ، دہلی 2011، ص 329)

البتہ جب وہ سودا اور ذوق کے ایک ایک مطلع کا تقابل کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ یہاں پہلے دونوں کے مطالع پیش کیے جاتے ہیں پھر ان کی آرا۔

واہ وا کیا معتدل ہے باغ عالم میں ہوا مثلِ نبضِ صاحب صحت ہے ہر موج صَبا
(ذوق)

صباح عید ہے اور یہ سخن ہے شہرۂ عام حلال دختر رز بے نکاح و روزہ حرام
(سودا)

> ''اس مطلع میں وہ شگفتگی اور برجستگی بھی نہیں جو اُن کے دوسرے مطلعوں میں ہے۔ سودا نے بھی عید کے ایک تہنیتی قصیدے میں لفظی و معنوی

رعایت ہر طرح ملحوظ رکھی ہے لیکن جب وہ مطلع کہتے ہیں تو ایک ایک لفظ
سے سرشاریاں جھلکتی ہیں۔'' (ایضاً، ص 335)

ہوسکتا ہے کہ سودا کے اس مذکورہ بالا مطلع سے عید کی سرشاریاں جھلکتی ہوں لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ یہ مطلع Loud بھی ہے، Open بھی ہے اور قدرے ثقیل بھی، جبکہ ذوق کے مطلع میں واقعی ایک طرح کا اعتدال پایا جاتا ہے اور وہ بھی لفظی و معنوی رعایتوں کے ساتھ۔ باغ عالم میں جو ہوا چل رہی ہے وہ اس قدر معتدل ہے جیسے ایک صحت مند انسان کی نبض چلتی ہے۔ انسانی نبض کی حرکت میں بھی باغ عالم میں چلنے والی معتدل ہوا کے سبب اعتدال پیدا ہوگیا ہے۔ سودا کے مطلع میں زبردستی کی سرشاری ڈھونڈی جارہی ہے۔ عید کی صبح بے نکاح دختر رز بھی (شراب) جائز ہے اور روزہ حرام۔ عید کے روز روزہ رکھنا حرام ہے لیکن شراب کیسے حلال ہوگئی؟ اگر اسلامی شعار کو پیش کرتے ہوئے روزے کے حرام ہونے کی بات کی جارہی ہے تو اس نکتہ کا بھی خیال رکھا جانا چاہیے تھا۔ اگر محض بہاریہ تشبیب سمجھ کر بھی شعر کی داد دی جائے تو شاید ذوق کا مطلع سودا کے اس مطلع پر فوقیت ہی رکھتا ہے اور یہ بھی کہ کسی سخن کے شہرۂ عام کا ہونا کوئی محاورہ بھی نہیں جس کی داد دی جائے۔

شاعری میں، جو الفاظ وتراکیب کی مینا کاری ہوتی ہے، ذوق اس کی پاسداری خوب خوب کرتے ہیں۔ ایسے مواقع تشبیب کے شعروں میں زیادہ ملتے ہیں۔ تنویر احمد علوی نے اس نوع کی مثالیں پیش کرتے ہوئے جو خامہ فرسائی کی ہے اس کی روشنی میں ذوق کے شعروں میں بوقلموں نقوش ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں جو قصیدہ آزاد نے درج کیا ہے اور جس پر یہ نوٹ بھی لگایا ہے کہ ''افسوس کہ نظر ثانی سے نور نہ پایا ورنہ عجب جلوہ دکھاتا۔'' اس کے چند شعر دیکھیے پھر اندازہ ہوگا کہ ذوق لفظوں کی حدت اور ان لفظوں میں پوشیدہ موسیقیت اور غنائیت سے کس درجہ واقف تھے۔

صبح سعادت، نور ارادت، تن بہ ریاضت، دل بہ تمنا
جلوۂ قدرت، عالم وحدت، چشم بصیرت، محو تماشا

مرغ خوش الحاں بر سرِ بُستاں، ہر گل بُستاں خرّم و خنداں
گوشِ شقائق محو سرود و دیدۂ نرگس مستِ تمنا
خندۂ گل پر نغمۂ مُل پر، سرو چمن پر لطف سخن پر
نغمۂ بلبل نالۂ صُلصُل، قہقہۂ قُلقُل برلبِ مینا
وہ لب میگوں، عارض گلگوں وہ قد موزوں چشم پُر افسوں
برگِ گل تر، لالۂ احمر، سرو و صنوبر نرگسِ شہلا

اس نوع کے شعروں میں جو زیر و بم اور غنائیت ہے وہ لائق توجہ ہے۔ آخر کے شعر میں دیکھیے کہ لف ونشر مرتب کا کس خوب صورتی سے اہتمام کیا ہے۔ لب میگوں کو برگ گل، عارض گلگوں کو لالۂ احمر، قد موزوں کو سرو وصنوبر اور چشم پُر افسوں کو نرگس شہلا کہا گیا ہے۔ یہ ہے استادی اور رموز شاعری سے کما حقہٗ تعلق خاطر کا نمونہ۔ شروع کے تین اشعار درج کرنے کے بعد تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

> ''یہ تشبیب ذوق کی عالمانہ تخیل پسندی، فن کارانہ صورت گری اور استادانہ خوش ترکیبی کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس میں صوت وصدا کا اتار چڑھاؤ، صنائع بدائع کی رنگ آمیزی، لفظوں کا رکھ رکھاؤ ترجیع وتقسیم کس قدر سامعہ نواز ونظر فریب ہے''

(ذوق سوانح اور انتقاد، 1963، مکتبہ لاہور، ص 234)

لیکن اسی جذب وترنم، کیف ونشاط، اور الفاظ وتراکیب کی شگفتگی پر عبدالحق صاحب کی رائے سنیے جس پر کف افسوس ملنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...اس سے بھی زیادہ نغمہ وشعر سے عاری اُن کا وہ قصیدہ ہے جس میں مقفیٰ الفاظ کی کثرت نے اسے ایک عجوبہ بنا دیا ہے۔''

(ذوق دہلوی ایک مطالعہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، 2000، ص 54)

اوپر جو چار مرصع اشعار آپ نے ملاحظہ فرمائے، آپ خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ اشعار نغمگی اور شعریت سے عاری ہیں کہ یہ اوصاف ان میں بدرجۂ اتم موجود ہیں؟ اور اگر

یہ قصیدہ بقول عبدالحق ایک عجوبہ بن گیا ہے تو عجوبہ بننے اور بنانے کے عوامل کیا ہیں؟ اس میں جس خوب صورتی سے ذوق نے باطنی طور پر بھی قافیہ پیائی کی ہے، اس کی بھی داد دی جانی چاہیے، کیونکہ اس سے بھی صوت وصدا کی ایک لَے پیدا ہوتی ہے، زیر و بم ابھرتا ہے Rhythm پیدا ہوتا ہے۔ یہاں ذوق کی استادی اور خلّاقانہ قوت آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

اس کے لیے انھوں نے قاآنی کے ایک قصیدے کے چند شعر پیش کر کے ذوق کی شاعری میں جو بہاؤ ہے اُسے کمزور بتانے کی کوشش کی ہے۔

اسی طرح کلیم الدین احمد نے یہ لکھا کہ:

''سودا کا تخیل ہے کہ ایک سیل بے پناہ رواں ہے جسے روکنا مشکل ہے۔ ذوق کا تخیل بھی رواں ہے مگر اس کی رفتار میں کچھ رکاوٹ سی معلوم ہوتی ہے۔ زور اُسے بھی میسر ہے، لیکن یہ زور رک رک کر اپنا جوش دکھاتا ہے جیسے راہ میں کوئی شے حائل ہے۔''

(اردو شاعری پر ایک نظر، بک امپوریم، 1985، ص 302)

آپ کلیم صاحب کے اس اقتباس پر غور کیجیے اور اوپر کے جن اشعار کے حوالے سے بات ہورہی ہے، یہ بتایئے کہ یہاں معانی میں کوئی شئے حائل ہے اور وہ کون سا زور ہے، جو رک رک کر اپنا جوش دکھاتا ہے؟ اور اگر سودا کے یہاں ایک سیل بے پناہ ہے جسے روکنا بھی مشکل ہے، تو بھلا یہ خوبی ہوئی کہ خامی، معلوم نہیں ایسے منجھے ہوئے نقادوں نے بھی ایسے جملے کیوں کر لکھے؟ اور آخر میں یہ بھی فتویٰ صادر ہوا کہ ذوق کے قصائد شاعرانہ مشق سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اب ذرا توقف فرما کر غور کیجیے کہ قصیدہ گوئی میں شاعرانہ مشق و مزاولت کا گزر ہوتا ہے یا پھر کوئی قصیدہ ایک دم سے نازل ہوجاتا ہے؟ کیا سب کچھ یوں ہی وقوع پذیر ہوتا ہے؟ کیا قصیدے میں محض الہام ہی الہام ہوتا ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ قصیدہ لکھتے ہوئے کہانی یا فکشن لکھنے سے پہلے جو خاکہ یا پلاٹ بنایا جاتا ہے، کم و بیش وہی طریقہ یہاں بھی پیش نظر ہوتا ہے۔ یوں بھی شاعری اور اچھی شاعری اور پھر علمی و تہذیبی فضا کے ساتھ، اور وہ بھی جہاں مدح سرائی بھی کرنی ہو، بھلا بغیر مشق و مزاولت کے قصیدہ

کیسے وجود پذیر ہوسکتا ہے؟ ذوق کے شعری وقار کو جان بوجھ کر بھی ناقدوں نے کم تر یا مجروح کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن جو زباں داں اور شاعری کے جید عالم و پارکھ ہیں، ان کی رائے بھی دیکھی جانی چاہیے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے مولوی عبدالحق کے انتخاب ذوق وظفر پر ایک مختصر سا مقدمہ تحریر کیا تھا، لکھتے ہیں:

''قصیدے کی صنف کو تو اس معراج پر پہنچایا جس کے آگے لے جانے کا خیال، اگر کسی کو ہوا تو سودا ہے۔ اردو میں قصیدہ مرزا رفیع سے شروع ہوکر ابراہیم ذوق پر ختم ہوا۔

(انتخاب دیوان ذوق وظفر، انجمن ترقی اردو، 1945، ص6)

میں نے قصیدے کے الگ الگ اجزا کی روشنی میں کوئی تفصیلی بحث نہیں کی ہے اور شاید اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ گریز اہم تو ہوتا ہے لیکن اس کی حیثیت جگنو جیسی جھلک دکھا جانے کی ہوتی ہے۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو گریز کا استعمال شاعر مدح سرائی سے پہلے فضابندی کے لیے کرتا ہے۔ قصیدے میں تشبیب کے بعد دراصل مدح کا حصہ ہوتا ہے جس میں ممدوح کے شایان شان اوصاف یا اس سے منسوب احوال وکوائف کو نہایت ہی خوب صورتی سے جزالت اور پرشکوہ انداز میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہاں حفظ مراتب کا خیال بھی ضروری ہے ورنہ مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوجانے کا بھی خدشہ ہوتا ہے۔ تنویر احمد علوی نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اس فرق مراتب کو ملحوظ نہیں رکھتا تو اس کی مدح اصول بلاغت کی رو سے غلط اور غیر مستحسن قرار پائے گی۔ (ذوق سوانح اور انتقاد، ص245)

شاعر کبھی ممدوح کی شان و شخصیت اور کبھی اس کی عدل گستری، کبھی اس کے غصے اور ہیبت، کبھی اس کے زور بازو اور اس کی شمشیرزنی، کبھی اس کے گھوڑے اور کبھی گھوڑے کی رفتار کی تعریفیں کرتا ہے۔ آیئے ممدوح کی شان میں الگ الگ قصائد سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

تیرا دروازۂ دولت ہے مقامِ اُمید   تیرا دیوانِ عدالت ہے محلِ عبرت
کیسۂ گوہرِ انجم ترا صرفِ انعام   طاقۂ اطلس گردوں ترا وقفِ خلعت

ذہن عالی ہے ترا طائرِ شاخِ سدرہ	طبع رنگیں تری گل چینِ ریاضِ جنت

اوپر کے تین اشعار میں سے آخری دو کا مفہوم یہ ہے کہ یہ جو آسمان ریشم کے تھان کی طرح دکھائی دے رہا ہے دراصل تو نے ہی انعام میں بطور خلعت پیش کیا ہے اور یہ جو موتی جیسے ستارے چمک رہے ہیں وہ تو نے ہی بطور انعام کے عطا کیے ہیں۔ اس کے بعد والے شعر میں ذوق نے بادشاہ کی فکری بلندی کے لیے کہا کہ عرش پر جو سدرہ درخت ہے اس کی شاخ پر جو پرندہ بیٹھا ہوا ہے، دراصل وہی مقام ہے ترے ذہن عالی کا، اور تیری طبیعت کی جو رنگینی ہے وہ باغ جنت سے پھول چنتی ہے۔ یعنی تیری طبیعت کی شگفتگی گلزار جنت کی طرح شگفتہ ہے۔ لفظوں کے انتخاب اور استعاروں اور تمثیلوں کے لیے ذوق کا ذہن کیسا کھلا ہوا تھا۔ موتی کیسہ یعنی تھیلی میں رکھتے ہیں اور خلعت و انعام میں موتی اور لباس فاخرہ دیتے ہیں۔ اسی مناسبت سے طاقِ اطلس یعنی ریشم کا تھان استعمال کیا گیا۔ اسی طرح رفعت و بلندی کے لیے شاخ سدرہ اور طبع رنگیں سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے گلزار جنت سے گل چینی کی بات کی گئی جو کہ ذوق کی تخلیقی جُودت کو ظاہر کرتی ہے۔

احتسابِ پاسِ دینداری سے تیرے دیں پناہ	فسق کو ہے ضعف اور تقوے کو ہر دم تقویت
ابرِ احسان و عطا، سرچشمۂ جود و سخا	معدنِ حلم و حیا، کوہِ وقار و تمکنت

دیا ہے رنج کو دھو تیرے غسلِ صحت نے	ضمیرِ خلق سے، اے بادشاہِ پاک ضمیر
شہنشہا! ترے یمنِ شفائے کامل سے	جو لاعلاج مرض تھے، وہ ہیں علاج پذیر
چلے نہ اشرفیِ آفتاب عالم میں	خطِ شعاع سے اس پر جو ہو نہ یہ تحریر
"ابوظفر، شہہِ والا گہر بہادر شاہ	سراجِ دینِ نبی، سایۂ خدائے قدیر
شہِ بلند نگہ، شہریار والا جاہ	خدیو مہر کلہ، خسرو سپہر سریر"

اوپر کے پہلے شعر میں کہا جارہا ہے کہ اے بادشاہ تیرے غسل صحت کے طفیل لوگوں کے ضمیر (دل) سے رنج و غم دھل گئے ہیں اور ایسا اس لیے بھی ہوا ہے کہ خود تیرا ضمیر بھی پاک صاف ہے۔ آگے کے شعر میں مزید اس بات کا شدت سے اظہار کیا گیا ہے کہ اے بادشاہ

چونکہ تجھے آج شفائے کامل نصیب ہوئی ہے، اس لیے اسی کی برکت (یُمن) سے اُن امراض کا بھی علاج ممکن ہوگیا ہے جو کہ لاعلاج تھے۔ مبالغہ آرائی ہے، لیکن اسلوب اظہار نے اس میں دلکشی پیدا کردیا ہے ساتھ اسے قبولیت بخشی ہے اور شعر کو سبک اور رواں بنا دیا ہے۔ قصیدے کے ایسے شعروں کو پڑھ کر ذوق کی قادرالکلامی اور تخلیقی قوت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔
اس طرح بادشاہ کی عدل گستری اور نظم و نسق کی تعریف سنیے۔

دورِ انصاف میں گر تیرے ہو کشتہ سیماب تو بلاشبہ پڑے دینی مہوس کو دیت

—

مجال کیا کہ ترے عہد میں شرر کی طرح اٹھائیں سر کو شرارت سے سرکشانِ شریر
ہوا میں آکے جو کرتا ہے سرکشی شعلہ تو چٹکیاں دل آتش میں لے ہے آتش گیر
ترے نسق سے جو بالکل رہی نہ خونریزی لڑائیوں میں کہیں پھوٹتی نہیں نکسیر

—

آتش و آب میں یہ ربط ترے عدل سے ہے دیوے ہیزم کو جلا کر، کوئی پانی میں جو ڈال
کاکل موجِ دُخاں کے لیے اس کے دریا لے، تہِ آب سے شانہ، یہ ماہی کا نکال

اب ذرا تیغ و تفنگ اور خنجر و شمشیر کی تعریف میں ذوق کی تخلیقی ہنرمندی کا کمال بھی دیکھتے چلیں۔

وہ برقِ قہر خدا، تیری تیغ آتش دم کہ جس کی آنچ ترے دشمنوں کو نارِ سعیر
جو ہے خدنگ کا تیرے، نشانہ چشمِ حسود تو ہے تفنگ کا تیرے، دلِ عدو نخچیر
جو تیر نکلے کماں سے تری، وہ ہوجائے طلب میں، جانِ عدو کی رواں قضا کا سفیر

—

وہ بہادر شہِ غازی کہ اگر تیغ اس کی اپنی دکھلائے چمک، چرخ پہ کٹ جائے ہلال

—

تا ناخنِ شمشیر، نہ ہو ناخنِ تدبیر دشمن کی ترے، ہو نہ کبھی عقدہ کشائی

—

تیرا نیزہ ہے وہ طائر کہ عوض دانے کے مہرۂ پشت سے، دشمن کے ہے چُگتا گوہر

اسی طرح آپ دیکھئے کہ ذوق ممدوح کی تحریر اور خط کی تعریف کس مبالغے مگر خوب صورتی سے کرتے ہیں۔

ترے ہے خامۂ طغرا نگار میں، یہ زور جو کھینچے اک روش خطِ محنی، وہ لکیر
تو اس سے، ایسے ہوں اشکال ہندسی پیدا مٹا دے، دیکھ کے اقلیدس، اپنی سب تحریر

ق

وہ روشنی ترے خط میں کہ ابن مقلہ اگر لگائے آنکھوں سے، سرے کی جا تری تحریر
تو ہو یہ نور بصارت کہ پڑھ لے حرف بہ حرف جو ہووے، لوحِ جبیں پر، نوشتۂ تقدیر

قصیدے کے اشعار میں جو شعری اور فنی رموز و نکات یا پھر صنائع بدائع کی جو ایک دنیا آباد ہے یا یوں کہہ لیں کہ ذوق نے اپنے قصائد کو مختلف علوم وفنون یا دینی و دنیوی نکات سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے، ان تمام باتوں کا تجزیہ بالتفصیل ممکن نہیں۔ جہاں جہاں ممکن ہوسکا ہے، میں نے اس جانب اشارے کردیے ہیں۔ آخر میں اس ضمن میں، البتہ وہی بات دہرانا چاہتا ہوں کہ ذوق کو ذوق ہی کے متون کی روشنی میں پڑھنے کی کوشش کی جائے تاکہ ان کے ساتھ، ان کی تخلیقی جودت و فطانت کے ساتھ جو ایک طرح کی ادبی بددیانتی کا سلسلہ دراز ہوتا گیا ہے، وہ کچھ کم ہو سکے۔

O

دیگر اصنافِ سخن: رباعیات وقطعات

رباعیات:

ذوق نے غزلیات وقصائد کے علاوہ کم کم ہی سہی، رباعیات وقطعات بھی کہے ہیں۔ بہت سے نامکمل قصائد ہیں جو 'ابیات قصائد' کے نام سے درج کردیے گئے ہیں۔ جہاں تک رباعی کا سوال ہے، ذوق نے بہت زیادہ رباعیاں نہیں کہی ہیں۔ کلیات ذوق مرتبہ تنویر احمد علوی میں پندرہ (15) رباعیاں (ص 268 تا 271) ہیں۔ اس کے علاوہ ص 342 پر 'رباعیات مدح' کے عنوان سے تین رباعیاں ملتی ہیں۔ جہاں تک کہ ان تینوں رباعیوں کے موضوعات کا تعلق ہے، ذوق نے یہاں بھی مدح سرائی کی ہے۔ یہاں ایک رباعی ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ ذوق نے کس خوب صورتی سے بادشاہ کی تعریف کے پہلو نکالے ہیں۔

خورشید سے، یک روز جہاں میں نو روز   اور تجھ سے جہاں، روز مسرّت اندوز
ہے تجھ کو، زمانے میں شرف دوازدہ ماہ   ہے مہر جہاں تاب کو، یک ماہ یک روز

عام طور پر رباعیات کے موضوعات میں علم وحکمت اور پند ونصائح یا فلسفے اور تصوف کے رموز پیش کیے جاتے ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی اور گہرے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر

کچھ نکات پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک رباعی ملاحظہ کیجیے جس میں ذوق نے اپنی زندگی اور اس کے حالات بیان کیے ہیں۔

اے ذوق کبھی تو نہ خوش اوقات ہوا　　اک دم نہ ترا صرف مناجات ہوا
جب تک تھا جواں، تھا جوانِ بدمست　　اب پیر ہوا تو پیر مناجات ہوا

خود سے مخاطب ہوکر ذوق کہتے ہیں کہ کبھی ترا وقت اچھا نہیں گزرا اور کوئی لمحہ یا کوئی گھڑی اللہ کی مناجات میں نہیں گزری۔ پوری جوانی بدمستی میں کٹ گئی اور جب بڑھاپا آیا تو پیرمناجات ہوگیا یعنی اب اللہ ہی اللہ ہے۔ ذوق نے اس رباعی میں خود پر ایک طرح سے طنز بھی کیا ہے۔ اب ایک ایسی رباعی ملاحظہ کیجیے جس میں ذوق نے علم اور دانائی اور پھر جہل کی حقیقت بتاتے ہوئے کہا ہے کہ ہم علم حاصل کرکے بھی عقل مند نہیں ہوئے اس جہل کا کیا ٹھکانہ۔ جبکہ ہمیں تو لگا تھا کہ علم حاصل کرکے کچھ سیکھ لیں گے، لیکن علم کے بعد بھی کچھ نہ جان سکے۔

اس جہل کا ہے ذوق ٹھکانہ کچھ بھی　　ہم پڑھ کے ہوئے علم، نہ دانا کچھ بھی
ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانیں گے　　جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

اس رباعی میں روانی بھی ہے اور نصیحت کی ترسیل کا سامان بھی۔

ایک رباعی ذوق نے حضرت حسن اور حسین کی تعریف میں کہی ہے۔ بڑی ہی خوب صورت رباعی ہے۔ کہا ہے کہ حسن اور حسین نبیؐ کے نواسے ہیں اور حضرت فاطمہ زہرا و حضرت علی کی آنکھوں کا نور ہیں۔ لہٰذا اے ذوق تو اُن کے نعلین (جوتے) اپنی آنکھوں سے لگا، تاکہ دنیا کا تماشا دیکھ سکے۔ یہاں دراصل نعلین سے مراد خاکِ نعلین جسے بطور سرمہ کے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بہت ہی عقیدت مندی اور تخلیقیت کے ساتھ یہ رباعی کہی گئی ہے۔ اب ایک رباعی اور پیش کی جاتی ہے جس میں محبوب ومعشوق کی آنکھ اور اس کے چہرے کی تعریف کی گئی ہے۔ گلابی شراب کا رنگ بھی ہوسکتا ہے اور گلابی اس پیالہ اور سبو کو بھی کہتے ہیں جس سے شراب پی جاتی ہے۔ محبوب کی آنکھ جب نشے کے عالم میں گلابی ہو جاتی ہے تو صوفی بھی اسے دیکھ کر شرابی ہوجاتا ہے۔ اگر وہ محبوب اپنا کتابی چہرہ دکھا دے تو سارے مدارس کفرانِ کتب کرلیں۔

قطعات:

قطعہ نگاری میں بھی نظم نگاری کا سا نظم وضبط ہوتا ہے یا ہونا چاہیے۔ ذوق نے بھی کئی قطعات کہے ہیں۔ کلیات ذوق میں ایک قطعہ تاریخ (قطعۂ تاریخ تعمیرِ چاہ معمرۂ محمد شاہ سہارنپوری) چار مصرعوں پر مشتمل، ایک قطعہ چار مصرعوں کا بادشاہ کی مدح میں اور ایک قطعہ چھ مصرعوں پر مشتمل ہے جس میں ماحول اور خوشگوار موسم کا ذکر ہے اور اسے پڑھ کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے جیسے کسی قصیدے کا ٹکڑا ہو۔ اس قطعہ کا یہ آخری شعر ملاحظہ کیجیے۔

مدح حاضر میں سنادے مطلعِ روشن کہ ذوق
منتظر مشرق میں بیٹھا مہر پُرتنویر ہے

اس زمین میں علامہ جمیل مظہری نے حضرت عباس اور زینب کی مدح میں قصائد کہے ہیں۔ اس کے علاوہ دو قطعات کلیات کے ص 342 اور 343 پر ہیں۔ دونوں میں خلعت ولی عہدی اور بادشاہ کی تعریف ہے۔ ایک قطعہ چار مصرعوں کا ہے اور دوسرا چھ مصرعوں کا۔ چھ مصرعوں والے قطعہ کے آخری دو شعروں میں بادشاہ کے انوار دانش سے خورشید (سورج) کے اکتسابِ فیض کا ذکر ہے اور شکار کے لیے بندوق لینے پر شیر گردوں کے بھی شکار ہونے کی بات کی گئی ہے۔ یہ دونوں اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ہوگیا خورشید مالامال، وہ بھی نور سے دی جو تو نے، دولتِ انوارِ دانش کی زکوٰت
ہاتھ میں بندوق لے، جس وقت تو بہر شکار شیر گردوں کو ہو مشکل ہاتھ سے تیرے نجات

اس کے علاوہ ایک قطعہ 'در مدح میرزا شاہ رُخ بہادر' ہے۔ چونکہ یہ شاہزادے کی تعریف میں ہے اور اس کی بہادری اور اس کے موقعۂ شکار کا نقشہ ہے، اس لیے یہاں ذوق نے خوب خوب مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے، اُسے 'ثانی رستم' کہہ کے آخر میں مادّۂ تاریخ بھی نکالا ہے جس سے 1261 ہجری مستخرج ہوتی ہے۔ اس قطعہ سے چند شعر ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

میرزا شاہ رُخ بہادر نے قصدِ صید افگنی کیا جس دم
نہ بچا، اُس شکار افگن سے صید کوئی، سوائے صیدِ حرم
مرغ و سیمرغ اور غزال و پلنگ ہوئے مسکن پذیر دشتِ عدم
ہاتھ میں جب تفنگ لی اُس نے ہم سر اژدہائے آتش دم
کئی شیر ژیاں شکار کیے اس غضنفر شکار نے، پیہم

(کلیاتِ ذوق از تنویر احمد علوی، ص 341)

مذکورہ بالا قطعات کے علاوہ دو طویل قطعات، ایک تیرہ (13) اشعار پر اور دوسرا بیس (20) اشعار پر مشتمل ملتے ہیں۔ ایک اور قطعہ چار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ چھ قطعات اور ہیں جو رباعی کی ہیئت یعنی چار چار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ ایک شعر تو ضرب المثل کی طرح مشہور ہے۔ موذن مرحبا بروقت بولا۔ تری آواز مکّے اور مدینے۔ ایک قطعہ کا یہ آخری شعر ہے۔ اس طویل قطعہ میں (20 اشعار) ذوق نے عاشق زار کی حالت کا بیان کیا ہے۔ مناسب ہوگا اگر اس قطعہ سے چند اشعار یہاں پیش کر دیے جائیں۔

کہوں اے ذوق کیا حالِ شبِ ہجر کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
کہاں میں اور کہاں یہ شب، مگر تھے مری جانب سے تیرے دل میں کینے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
کہا جی نے کہ مجھ کو ہجر کی رات یقیں ہے صبح تک دے گی نہ جینے
بشارت مجھ کو صبحِ وصل کی دی اذاں کے ساتھ یُمن و فرخی نے
موذن مرحبا بروقت بولا تری آواز مکّے اور مدینے

(ماخوذ: کلیاتِ ذوق از تنویر احمد علوی، ص 265، 266)

دوسرا قطعہ جو 13 اشعار پر مشتمل ہے اس میں ایک ایسے شخص کے حوالے سے تجربات اور مشاہدات پیش کیے گئے ہیں جو تارکِ دنیا ہوگیا ہے۔ راوی اس تارکِ دنیا سے سوال کرتا ہے کہ اب تو زندگی آرام سے گزرتی ہوگی۔ وہ شخص یہ تجربہ بیان کرتا ہے کہ جب تک حیات ہے آسودگی مشکل ہے۔ دنیا سے الگ ہوکر بھی یہ ضروری نہیں کہ کنجِ عافیت نصیب ہو۔ کیونکہ

انسان دنیا کی قید سے نکل کے فقیری کی قید میں آجاتا ہے۔ اس لیے کہ حق پرستی سے پہلے پیر پرستی کرنی ہوتی ہے۔ ہمیشہ تصوف کی اعلیٰ منزل تک پہنچنے کی ہوس ہوتی ہے۔ نفس ایک بڑا دشمن ہے، اسے شکست دینے کی فکر لگی رہتی ہے۔ کسی طرح بھی تعلقات سے آزادی حاصل نہیں ہوسکتی۔ آخر میں ایک فارسی شعر پر اختتام کیا ہے کہ کسی نے کیا ہی برجستہ کہا ہے کہ قطع تعلق کر کے بھلا کب کوئی آزاد رہ سکتا ہے، اگر سب سے کٹ جاتا ہے تو خدا کا قیدی ہوجاتا ہے۔

کہ کرد قطع تعلق کدام شد آزاد　　بریدۂ ز ہمہ باخدا گرفتار است

(نامعلوم)

یہ قطعہ غیر مردّف ہے، اور اس کی توجیہ دتاویل یہ ہوسکتی ہے کہ چونکہ ذوق کا ذہنی و تخلیقی میلان فنِ قصیدہ نگاری کی طرف رہا ہے، اس لیے وہ اس نوع کے قوافی کو بھی برتنے میں زیادہ تردد محسوس نہیں کرتے۔ مناسب ہوگا اگر اس قطعہ سے بھی چند اشعار پیش کر دیے جائیں۔

کل ایک تارک دنیا سے میں نے پوچھا ذوق　　کہ تو اکھڑ کے اُدھر سے اِدھر ہوا پیوست
کہا یہ اس نے کہ قید حیات میں انساں　　کبھی نہ ہوگا دل آسودہ گو ہو مستِ الست
چھٹا جو کوئی گرفتاریوں سے دنیا کی　　تو سلسلے میں فقیری کے پھر ہوا پابست
رہا وہ خدمت مرشد کی قید میں برسوں　　کہ حق پرست ہو وہ، پہلے جو ہو پیر پرست
نہیں ہے دام علائق سے مطلق آزادی　　مجال کیا کہ نکل جائے کوئی کرکے جست

رباعیات وقطعات کے علاوہ چند نامکمل غزلیات کے اشعار اور الگ سے ابیات کے ذیل میں چند مفرد اشعار بھی ملتے ہیں۔ کلیاتِ ذوق میں ایک مثنوی بھی ہے، جو کہ 31 اشعار پر مشتمل ہے۔ شاید کہ ذوق کا میلان طبع اس فن کی طرف نہیں تھا۔ یہاں آخر میں ذوق کے چند اشعار 'ابیات' کے ذیل سے پیش کیے جاتے ہیں جو کہ کسی غزل سے ماخوذ نہیں۔

راتوں کو نہ ہو، حق کر اے شیخ مناجاتی　　سوتے ہوئے چونکیں گے رندان خراباتی
کتنے مفلس ہوگئے کتنے تونگر ہوگئے　　خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہوگئے

اگر اٹھے تو آزردہ جو بیٹھے تو خفا بیٹھے　　لگایا جی کو اپنے روگ جب سے جی لگا بیٹھے

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے　　حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مُرجھا گئے

ہم تو ویران ہو اس طرح وطن سے نکلے　　روح جس طرح کسی شخص کی، تن سے نکلے

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا　　کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

○

انتخابِ کلام

غزلیات

(1)

جینا ہمیں اصلا نظر اپنا نہیں آتا
گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

دیتا، دلِ مضطر کو، تری کچھ تو نشانی
پر خط بھی ترے ہاتھ کا لکھا نہیں آتا

آئے تو کہاں جائے نہ تا جی سے کوئی جائے
جب تک، اُسے غصہ نہیں آتا نہیں آتا

کیا جانے اسے وہم ہے کیا میری طرف سے
جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا

آیا ہے دم آنکھوں میں دمِ حسرتِ دیدار
پر لب پہ کبھی حرفِ تمنا نہیں آتا

کس دم نہیں ہوتا قلقِ ہجر ہے مجھ کو
کس وقت مرے منہ کو کلیجا نہیں آتا

ہم رونے پہ آ جائیں تو دریا ہی بہائیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

آنا ہے تو آ جا کہ کوئی دم کی ہے فرصت
پھر دیکھیے، آتا بھی ہے دم، یا نہیں آتا

دل مانگنا مفت اور پھر اس پر یہ تقاضا
کچھ قرض تو بندہ پہ تمہارا نہیں آتا

غافل ہے بہارِ چمنِ عمرِ جوانی
کر سیر کہ موسم یہ دوبارہ نہیں آتا

دنیا ہے وہ صیاد کہ سب دام میں اس کے آ جاتے ہیں، لیکن کوئی دانا نہیں آتا
مرنے کا مزہ وہ ہے ترے کوچے میں قاتل جاتا ہے وہاں کوئی تو جیتا نہیں آتا
بے جا ہے دلا اس کے نہ آنے کی شکایت کیا کیجیے گا فرمایئے اچھا نہیں آتا
میں جاتا جہاں سے ہوں، تو آتا نہیں یاں تک کافر تجھے کچھ خوف خدا کا نہیں آتا
ساتھ اس کے ہیں ہم سایہ کی مانند ولیکن اس پر بھی جدا ہیں کہ لپٹنا نہیں آتا
جاتی رہے زلفوں کی لٹک دل سے ہمارے افسوس کچھ ایسا ہمیں لٹکا نہیں آتا
ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارا نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق، مجھے کیا نہیں آتا

(2)

ہر اک سے ہے قول آشنائی کا جھوٹا وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا
نگارا، ترے ہاتھ میں بدنما ہے نگیں، خاتم دل ربائی کا جھوٹا
مزے موت کے خضر لے گر پلائے وہ پانی مریض جدائی کا جھوٹا
مجھے نعمتِ خلد سے بھی ہے بہتر ترے در پہ ٹکرا گدائی کا جھوٹا
رسائی ہوئی جب کہ دامن تک اس کے ہوا ہاتھ اپنا رسائی کا جھوٹا
نہ کیوں ترے دانتوں سے جھوٹا ہو موتی کہ دعویٰ کیا تھا صفائی کا جھوٹا
نہ منھ ڈال، خار آبلے میں کہ ہوگا یہ ساغر، مئے کہربائی کا جھوٹا
بناتا ہے مہر و محبت میں تجھ کو یہ شیوہ ترا بے وفائی کا جھوٹا
خدا جانے ہے ذوق سچا کہ جھوٹا نہیں ہے مگر آشنائی کا جھوٹا

ابھی ذوق آیا ہے تو میکدے سے
یہ دعویٰ نہ کر پارسائی کا جھوٹا

(3)

شکر پردے ہی میں اس بت کو حیا نے رکھا
ورنہ ایمان گیا ہی تھا، خدا نے رکھا

آنکھیں دیدار طلب، گور سے آئی ہیں نکل
دستہ نرگس کا نہیں میرے سرہانے رکھا

رہا پامال رہِ عشق کی تربت کا نشاں
اُس پہ تعویذ جو نقشِ کفِ پا نے رکھا

بچے ناواقفِ رہ، پہلے ہے رہبر موجود
گور سے آگے قدم، دیکھ عصا نے رکھا

تلخ کامی کا رہا بعدِ فنا بھی یہ اثر
اُستخواں کو مرے منھ پر نہ ہما نے رکھا

ناتواں ہیں نہ تنِ زار مرا دیکھ سکا
خوب دھوکے میں اُسے تارِ قبا نے رکھا

آشیاں ڈھونڈا چمن میں جو قفس سے جا کر
ایک تنکا بھی نہ تھا، بادِ صبا نے رکھا

شربتِ مرگ سے محروم نہ رہتا کبھی خضر
حیف محروم اُسے آبِ بقا نے رکھا

دل یہ دیوانہ نہ تھا میرا تو پھر کیوں اس کو
پا بہ زنجیر تری زلفِ دوتا نے رکھا

کیا تماشا ہے کہ دیوانہ بنا کر اپنا
نام مجنوں مرا اُس ہوش ربا نے رکھا

نہ رکھے خوبی و زشتی سے غرض، آئینہ دار
گھر میں مہمان جسے اہلِ صفا نے رکھا

نہ گیا، مر کے بھی، اس مصحفِ رخسار کا شوق
کہ رہا گور پہ قرآن، سرہانے رکھا

بے نشاں، پہلے فنا سے ہو، جو ہو تجھ کو بقا
ورنہ ہے کس کا نشاں ذوقِ فنا نے رکھا

(4)

ہنگامہ گرم ہستیِ ناپائیدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

میں وہ شہید ہوں، لبِ خنداں یار کا
کیا کیا چراغ ہنستا ہے میرے مزار کا

ہو رازِ دل نہ یار سے پوشیدہ، یار کا
پردہ جو درمیاں نہ ہو دل کے غبار کا

اس روئے تابناک پہ ہر قطرۂ عرق
گویا کہ اک ستارہ ہے صبحِ بہار کا

ہے عینِ وصل میں بھی، مری چشم سوئے در
لپکا، جو، پڑ گیا ہے مجھے انتظار کا

پہنچے گا تیرے پاس، کبوتر سے پیشتر
مکتوبِ شوق اُڑ کے ترے بیقرار کا

ہو پاک دامنوں کو خلش کر سے کیا خطر
کھٹکا نہیں نگاہ کو مژگاں کے خار کا

بجھنے کی دل کی آگ نہیں زیرِ خاک بھی
ہوگا، درخت، گور پہ میری، چنار کا

دیکھ اپنے درِ گوش کو عارض سے متصل
دیکھا نہ ہو ستارہ جو صبحِ بہار کا

پوچھے ہے کیا حلاوتِ تلخابۂ سرشک
شربت ہے، باغِ خلدِ بریں کے انار کا

ہے دل کی داؤ گھات میں مژگاں سے چشمِ یار
ہے، شوق اس کو ٹٹی کی اوجھل شکار کا

قاصد لکھوں، لفافۂ خط کو، غبار سے
تا جانے وہ، یہ خط ہے کسی خاکسار کا

اے ذوق ہوش گر ہے تو دنیا سے دور بھاگ
اس میکدہ میں کام نہیں ہوشیار کا

(5)

وہ کون ہے جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا
پر میرا جگر دیکھ کہ میں اُف نہیں کرتا

کیا قہر ہے، وقفہ ہے ابھی آنے میں اُس کے
اور دم مرا، جانے میں، توقف نہیں کرتا

کچھ اور گماں، دل میں، نہ گزرے، ترے کافر
دم، اس لیے میں سورۂ یوسف نہیں کرتا

پڑھتا نہیں خط، غیر مرا، واں کسی عنواں
جب تک کہ وہ مضموں میں تصرف نہیں کرتا

دل، فقر کی دولت سے مرا اتنا غنی ہے
دنیا کے زر و مال پہ، میں تف نہیں کرتا

اے ذوق تکلف میں، ہے تکلیف، سراسر
آرام میں ہے، وہ جو تکلف نہیں کرتا

(6)

نالہ اُس شور سے کیوں میرا، دہائی دیتا
اے فلک گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا

دیکھ، چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

لاکھ دیتا فلک، آزار گوارہ تھے مگر
ایک تیرا نہ مجھے دردِ جدائی دیتا

دے دعا وادیِ پرخار جنوں کو، ہر گام
داد، یہ تیری ہے اے آبلہ پائی دیتا

روشِ اشک، گرا دیں گے نظر سے اک دن
ہے، اِن آنکھوں سے، یہی مجھ کو دکھائی دیتا

منھ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے — گر انھیں آکے خدا ساری خدائی دیتا

پنجۂ مہر کو بھی خونِ شفق میں، ہر صبح — غوطے کیا کیا ہے ترا دستِ حنائی دیتا

کون، گھر آئینے کے آتا اگر وہ دل میں — خاکساری سے، نہ جاروبِ صفائی دیتا

میں وہ ہوں صید کہ پھر دام میں پھنستا جاکر — گر، قفس سے، مجھے صیاد، رہائی دیتا

خوگرِ ناز ہوں کس کا کہ مجھے ساغر سے — بوسۂ لب نہیں، بے چشم نمائی، دیتا

دیکھ، گر دیکھنا ہے ذوق کہ وہ پردہ نشیں
دیدۂ روزنِ دل سے ہے دکھائی دیتا

(7)

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا — اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا — فرشتہ اُس کا ہم پایہ نہ پایا

مقدر ہی پہ گر سود و زیاں ہے — تو ہم نے کچھ یہاں کھویا نہ پایا

وہ از خود رفتہ ہوں جس کو خودی نے — خدائی میں اگر ڈھونڈھا نہ پایا

رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم — کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا

احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے — نکل جاتے مگر رستا نہ پایا

جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا — کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

تہِ خنجر ترے بسمل نے ہے ہے — ذرا قابو تڑپنے کا نہ پایا

مزارِ کشتۂ خونیں کفن پہ — سوائے لالۂ صحرا نہ پایا

سراغِ عمرِ رفتہ ہو تو کیوں کر — کہیں جس کا نشاں پایا نہ پایا

لحد میں بھی ترے مضطر نے آرام — خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا

رہِ گم گشتگی میں ہم نے اپنا — غبارِ راہ بھی عنقا نہ پایا

کہے کیا ہائے زخمِ دل ہمارا — دہن پایا لبِ گویا نہ پایا

وہ بولے دیکھ کر تصویرِ یوسف — سنا جیسا اسے ویسا نہ پایا

سوائے دردو دردِ بے کسی میں — کوئی ہمدرد وا دردانہ پایا
نہ مارا تو نے پورا ہاتھ قاتل — ستم میں بھی تجھے پورا نہ پایا
چراغِ داغ لے کر دل میں ڈھونڈا — نشاں پر صبر و طاقت کا نہ پایا
سوا اس کے خطِ مشکیں کے کوئی — مجرب نسخۂ سودا نہ پایا
مرے طالع کی وہ گردش ہی جس سے — فلک نے بھی قرار اصلا نہ پایا
کبھی تو اور کبھی تیرا رہا غم — غرض خالی دلِ شیدا نہ پایا

نظیر اس کا کہاں عالم میں اے ذوق
کوئی ایسا نہ پائے گا نہ پایا

(8)

نام یوں پستی میں بالاتر ہمارا ہوگیا — جس طرح پانی کنویں کی تہہ میں تارا ہوگیا
میرے گریہ سے جو پانی سنگِ خارا ہوگیا — کوہ کے چشموں کا ہر آنسو شرارا ہوگیا
ذکرِ دُنیا نفسِ مردہ کو ہوا آبِ حیات — مر کے یہ سیماب پھر زندہ دوبارا ہوگیا
دانت یوں چمکے ملسی میں رات اُس مہ پارہ کے — میں نے جانا ماہِ تاباں پارہ پارہ ہوگیا
دل پہ زخموں کی ترقی سے ہوئی اک اور بہار — آگے تھا صد برگ اب یہ گل ہزارا ہوگیا
ہر حبابِ بحر کی کھل جائے گی تاراں آنکھ — عکس افگن گر رخِ روشن تمھارا ہوگیا
شیخ نے افطاریوں کے تر نوالے کھا لیے — ہاں مگر روزے کی خشکی سے چھوارا ہوگیا
ہے مقامِ زندگی زیرِ دمِ شمشیرِ مرگ — ہوگیا جس طرح کوئی دم گزارا، ہوگیا
ظلمتِ عصیاں سے میری بن گیا شب روزِ حشر — آفتاب اک نیزے پر دُم دار تارا ہوگیا
ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار — پر اُمیدِ وصل میں برسوں گوارا ہوگیا
رشک سے اس زلف کے کیا مشک ہی یکسر ہے خوں — بلکہ جل کر سوختہ عنبر بھی سارا ہوگیا
دی شہادت نشے کی سرخی سے چشمِ یار نے — لو ہمارا خونِ پنہاں آشکارا ہوگیا

ذوق اس بحرِ جہاں میں کشتیِ عمرِ رواں
جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہوگیا

(9)

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا   جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا
نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا   اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا   نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا
خطا تو دل کی تھی قابل، بہت سی مار کھانے کی   تری زلفوں نے مشکیں باندھ کر مارا تو کیا مارا
نہیں وہ قول کا سچا، ہمیشہ قول دے دے کر   جو اس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا
تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھے کچھ پاس قاتل کے   الٰہی اس نے دل کو تاک کر مارا تو کیا مارا
ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا   کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا
مرے آنسو ہمیشہ ہیں برنگِ لعل غرقِ خوں   جو غوطہ آب میں تو نے گہر مارا تو کیا مارا
جگر دل دونوں پہلو میں ہیں زخمی اس نے کیا جانے   اِدھر مارا تو کیا مارا، اُدھر مارا تو کیا مارا
گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے میں   اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا
دلِ سنگینِ خسرو پر بھی ضرب اے کوہکن پہنچی   اگر تیشہ سرِ کہسار پر مارا تو کیا مارا

دلِ بد خواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بد بیں میں
فلک پر ذوقؔ تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

(10)

طلبِ حق میں اگر بادیہ پیما ہوتا   میرا ہر آبلۂ پا یدِ بیضا ہوتا
آنکھ اٹھا اپنے جو بیمار کو دیکھا ہوتا   تجھ پہ قربان میں اے رشکِ مسیحا ہوتا
خاک ہو جاتا اگر راہِ خدا میں بخدا   تو نہ سر، سنگِ درِ دیر و کلیسا ہوتا
قدرتِ حق سے عجب کیا جو مری رہ کا غبار   رونقِ افسرِ اسکندر و دارا ہوتا
دیکھ سکتا جو تجلیِ رخِ جاناں کو   'لن ترانی' کا سزاوار نہ موسیٰ ہوتا
رنجِ دوریِ صنم اور جو ہوتا چندے   مسکنِ نالۂ دل عرشِ معلیٰ ہوتا
دیکھتا چاہِ ذقن کو جو تہِ سبزۂ خاک   خضر کو چشمۂ ظلمات کا دھوکا ہوتا

آستاں بوسیِ سلطاں سے نہ کرتے پرہیز — ہم کو گر حوصلۂ ثروتِ دنیا ہوتا
شبِ فرقت میں جلا کرنے سے ہر شب کے صنم — کاش مرجاتا میں اک روز تو اچھا ہوتا

ذوق کہتا جو تو اور اس میں غزل تو، مائل
دلِ عالم نہ بجوش گوئی سودا ہوتا

(11)

معلوم جو ہوتا ہمیں انجامِ محبت — لیتے نہ کبھی بھول کے ہم نامِ محبت
ہیں داغِ محبت درم و دامِ محبت — مژدہ تجھے اے خواہشِ انعامِ محبت
نے زُہد سے ہے کام نہ زاہد سے کہ ہم تو — ہیں بادہ کشِ عشق و مے آشامِ محبت
ہر روز اُڑا دیتا ہے وہ کرکے تصدق — دوچار اسیرِ قفسِ دامِ محبت
مانندِ کباب آگ پہ کرتے ہیں ہمیشہ — دل سوز ترے بسترِ آرامِ محبت
ایماں کو گرو رکھ کے اگر کفر کو لے مول — کافر نہ ہو گرویدۂ اسلامِ محبت
کاسے میں فلک کے رہے اک بوند نہ زہراب — دھر کھینچے اگر تشنہ لبِ جامِ محبت
خاکسترِ پروانہ دکھا دوں میں اڑا کر — پوچھے کوئی مجھ سے اگر انجامِ محبت
کی جس نے ذرا رسمِ محبت اسے مارا — پیغامِ قضا ہے ترا پیغامِ محبت
شوقِ حرم کوچۂ قاتل میں کفن کو — ہم جانتے ہیں جامۂ احرامِ محبت
کہتی تھی وفا نوحہ کناں نعش پہ میری — سونپا کسے تو نے مجھے ناکامِ محبت

معراج سمجھ ذوق تو قاتل کی سناں کو
چڑھ سر کے بل اس زینے پہ تا بامِ محبت

(12)

مجنوں نے دی لگا جو سرِ خار زار پشت — پشت اب ہجومِ خار سے ہے پشتِ خار پشت
حوروں کے گر ہو پنجۂ مژگاں سے خار پشت — کھجلائے وہ پری نہ کبھی زینہار پشت

ماہی سے تا بہ ماہ ہیں دستِ فلک سے داغ　　واں داغدار سینہ ہے یاں داغ دار پشت

بارِ زمانہ پشت پہ لے کر شتر کی طرح　　سیدھی نہ کی فلک نے کبھی ایک بار پشت

پیدا فلک سے ایک نہ ہو تجھ سا ماہ وش　　گو پشت تک تو کیا کہ نہ تا نو ہزار پشت

سینہ سپر جو مہ پہ ہیں تیغِ نگاہ کے　　دکھلاتے وہ کبھی نہیں آئینہ وار پشت

ہو جائے ہے زیادہ گراں بارِ گناہ　　پیری میں کیوں خمیدہ نہ ہو زیرِ بار پشت

ڈر ہے یہی کہ ایسا نہ ہو بعدِ مرگ بھی　　لگنے نہ دے زمیں سے دلِ بےقرار پشت

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے رہے یہی دو پشت چار پشت

(13)

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد　　سینے میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

کیا روکا اپنے گریے کو ہم نے کہ لگ گئی　　پھر وہی آنسوؤں کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

کوئی گھڑی اگر وہ ملائم ہوئے تو کیا　　کہہ بیٹھیں گے پھر ایک کڑی دو گھڑی کے بعد

اس لعل لب کے ہم نے لیے بوسے اس قدر　　سب اڑ گئی مسی کی دھڑی دو گھڑی کے بعد

اللہ رے ضعف سینے سے ہر آہ بے اثر　　لب تک جو پہنچی بھی تو چڑھی دو گھڑی کے بعد

کل اُس سے ہم نے ترکِ ملاقات کی تو کیا　　پھر اس بغیر کل نہ پڑی دو گھڑی کے بعد

تھے دو گھڑی سے شیخ جی شیخی بگھارتے　　ساری وہ شیخی ان کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

کہتا رہا کچھ اس سے عدو دو گھڑی تلک　　غماز نے پھر اور جڑی دو گھڑی کے بعد

پروانہ گرد، شمع کے شب دو گھڑی رہا　　پھر دیکھی اس کی خاک پڑی دو گھڑی کے بعد

تو دو گھڑی کا وعدہ نہ کر دیکھ جلد آ　　آنے میں ہوگی دیر بڑی دو گھڑی کے بعد

گو دو گھڑی تک اس نے نہ دیکھا اِدھر تو کیا　　آخر ہمیں سے آنکھ لڑی دو گھڑی کے بعد

کیا جانے دو گھڑی وہ رہے ذوق کس طرح
پھر تو نہ ٹھیرے پاؤں گھڑی دو گھڑی کے بعد

(14)

نہ اس سے امن میں ایماں نہ دیں رہا محفوظ — تری نگاہ سے کافر رکھے خدا محفوظ

ہمارے نالوں سے خورشید کو کہاں ہے قرار — چراغ آندھی میں کس طرح رہ سکا محفوظ

ہمیشہ خالِ رخِ آتشیں کرے ہے پسند — کہ چشمِ بد سے ہے روئے نکو ترا محفوظ

کہاں دماغ رکھیں فکرِ چارہ سازیِ دل — کہ داغ، لالہ کا مرہم سے ہے سدا محفوظ

نہ کہیے کیوں کہ خموشی کہ قفلِ دُرجِ دہاں — درِ سخن نہ ہو ضائع رہے سدا محفوظ

ترا ہے نامہ مرے حفظِ جان کا تعویذ — رکھوں ہوں میں بھی جسے جان سے سوا محفوظ

کہے ہیں جس کو صبا، ہے وہ ایک بادی چور — چمن میں یہ زرِ گل رہوے تا کجا محفوظ

عزیز ہے ترا پیکان یاں تلک مجھ کو — رکھوں ہوں دل میں جسے جان سے سوا محفوظ

اُلجھتے پاک نفس لب ہیں ناکسوں کے ساتھ
خلش سے خار کی ہے دامنِ صبا محفوظ

(15)

جو کھل کر اُن کا جوڑا بال آئیں سر سے پاؤں تک — بلائیں آکے لیں سو سو بلائیں سر سے پاؤں تک

ہم ان کی چال سے پہچان لیں گے ان کو بُرقع میں — ہزار اپنے کو وہ ہم سے چھپائیں سر سے پاؤں تک

یہ جتنے سرو ہیں سب اس کے قد پر زہر کھاتے ہیں — چمن میں سبز کیوں کر ہو نہ جائیں سر سے پاؤں تک

مرا دل ایک، دوں اس خوش ادا کی کس ادا کو میں — کہ ہیں واں تو ادائیں ہی ادائیں سر سے پاؤں تک

نہ ہوں بے پردہ تو بھی وہ کھڑے ہو ہو کے شوخی سے — پھبن چلمن میں در پردہ دکھائیں سر سے پاؤں تک

بنایا اس لیے اس خاک کے پتلے کو تھا انساں — کہ اس کو درد کا پتلا بنائیں سر سے پاؤں تک

سراپا پاک ہیں دھوئے جنھوں نے ہاتھ دنیا سے — نہیں حاجت کہ وہ پانی بہائیں سر سے پاؤں تک

مزا اتنا ہی ذوق افزوں ہو جتنے زخم افزوں ہوں
نہ کیوں ہم زخمِ تیغِ عشق کھائیں سر سے پاؤں تک

(16)

عنقا کی طرح خَلق سے عُزلت گزیں ہُوں میں
ہُوں اس طرح جہاں میں کہ گویا نہیں ہُوں میں

اس در پہ شوقِ سجدہ سے فرشِ زمیں ہوں میں
مانند سایہ سر سے قدم تک جبیں ہوں میں

میں وہ نہیں کہ تم ہو کہیں اور کہیں ہوں میں
میں ہوں تمھارا سایہ جہاں تم وہیں ہوں میں

ہُوں طائرِ خیال، نہ پر ہیں نہ میرے بال
پر اُڑ کے جا پہنچتا کہیں سے کہیں ہوں میں

تارا سا ہوں کنوئیں کی میں تہہ پر مثالِ آب
گو نام آسماں پہ ہے زیرِ زمیں ہوں میں

دیتا ہے پیچ کیوں مجھے اس درجہ اے فلک
نے چینِ زلف نے شکنِ آستیں ہوں میں

(17)

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں

پھر مجھے لے چلا اُدھر دیکھو!
دلِ خانہ خراب کی باتیں

واعظا چھوڑ ذکرِ نعمتِ خلد
کہ شراب و کباب کی باتیں

مہ جبیں! یاد ہیں کہ بھول گئے؟
وہ شبِ ماہتاب کی باتیں

حرف آیا جو آبرو پہ مری
ہیں یہ چشمِ پُرآب کی باتیں

سنتے ہیں اُس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم
کس مزے سے عتاب کی باتیں

جامِ مے لب سے تو لگا اپنے
چھوڑ شرم و حجاب کی باتیں

مجھ کو رسوا کریں گی خوب اے دل
یہ تری اضطراب کی باتیں

جاؤ ہوتا ہے اور بھی خفقاں
سن کے ناصح جناب کی باتیں

قصۂ زلفِ یار دل کے لیے
ہیں عجب پیچ و تاب کی باتیں

ذکر کیا جوشِ عشق میں اے ذوق
ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

(18)

بلائیں آنکھوں سے اُن کی مدام لیتے ہیں
ہم اپنے ہاتھوں کا مژگاں سے کام لیتے ہیں

ہم اُن کی زلف سے سودا جو دام لیتے ہیں
تو اصل و سود وہ سب دام دام لیتے ہیں

شبِ وصال کے روزِ فراق میں کیا کیا
نصیب مجھ سے مرے انتقام لیتے ہیں

قمر ہی داغِ غلامی فقط نہیں رکھتا
وہ مول ایسے ہزاروں غلام لیتے ہیں

ہم اُن کے زور کے قائل ہیں، وہیں شہ زور
جو عشق میں دلِ مضطر کو تھام لیتے ہیں

قتیل نامِ بتاتے نہیں تجھے قاتل
جب ان سے پوچھو اجل ہی کا نام لیتے ہیں

ترے اسیر جو صیاد کرتے ہیں فریاد
تو پھر وہ دم بھی نہیں زیرِ دام لیتے ہیں

جھکائے ہے سرِ تسلیم ماہِ نو پہ وہ
غرورِ حسن سے کس کا سلام لیتے ہیں

ترے خرام کے پیرو ہیں جتنے فتنے ہیں
قدم سب آن کے وقتِ خرام لیتے ہیں

ہمارے ہاتھ سے اے ذوق وقتِ مے نوشی
ہزار ناز سے وہ ایک جام لیتے ہیں

(19)

گہر کو جوہری، صرّاف زر کو دیکھتے ہیں
بشر کے ہیں جو مبصر، بشر کو دیکھتے ہیں

نہ خوب و زِشت نہ عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں
یہ چیز کیا ہے بشر ہم بشر کو دیکھتے ہیں

وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں
محبت آج ترے ہم اثر کو دیکھتے ہیں

وہ اپنی بُرّشِ تیغِ نظر کو دیکھتے ہیں
ہم ان کو دیکھتے ہیں اور جگر کو دیکھتے ہیں

جب اپنے گریہ و سوزِ جگر کو دیکھتے ہیں
سلگتے آگ میں ہم خشک و تر کو دیکھتے ہیں

رفیق جب مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
تو چارہ گر انھیں وہ چارہ گر کو دیکھتے ہیں

نہ طمطراق کو، نے کرّ و فر کو دیکھتے ہیں
ہم آدمی کے صفات و سیر کو دیکھتے ہیں

جو رات خواب میں اس فتنہ گر کو دیکھتے ہیں
نہ پوچھو ہم جو قیامت سحر کو دیکھتے ہیں

وہ روز ہم کو گزرتا ہے جیسے عید کا دن
کبھی جو شکل تمھاری سحر کو دیکھتے ہیں

جہاں کے آئینوں سے دل کا آئینہ یہ جدا ۔۔۔ اس آئینے میں ہم آئینہ گر کو دیکھتے ہیں

بنا کے آئینہ دیکھے ہے پہلے آئینہ گر

ہنرور اپنے ہی عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

(20)

کرے وحشت بیاں چشمِ سخن گو اس کو کہتے ہیں ۔۔۔ یہ سچ کہتے ہیں سر چڑھ بولے جادو اس کو کہتے ہیں

سوالِ بوسہ کو ٹالا جوابِ چینِ ابرو سے ۔۔۔ براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو اس کو کہتے ہیں

جگر اور دل کا جتنا حوصلہ تھا تُل گیا سارا ۔۔۔ نگہ کے تیر کا ہونا ترازو اس کو کہتے ہیں

گوارا تلخی سے کیوں نہ ہو ہم خستہ جانوں کو ۔۔۔ یہ دارو تلخ ہی بہتر ہے دارو اس کو کہتے ہیں

گرہ کھولی ذرا اس نے جو اپنی زلفِ مشکیں کی ۔۔۔ معطر ہو گیا آفاق، خوشبو اس کو کہتے ہیں

جو پوچھے کوئی یہ مجھ سے بتا کیا نام ہے تیرا ۔۔۔ کہوں دیوانہ چشمِ پری رو اس کو کہتے ہیں

کھنچی شیریں نہ دل سے کوہکن نے کوہ کو کاٹا ۔۔۔ محبت یہ نہیں ہے زورِ بازو اس کو کہتے ہیں

اجل سو بار آئی پر نہ آیا جب تلک قاتل

نہ پایا دم نکلنے ذوق، قابو اس کو کہتے ہیں

(21)

نہ چھوڑا تارِ وحشت نے ہمارے جیب و داماں میں ۔۔۔ مگر تارِ نفس سینے میں سمجھو یا گریباں میں

کوئی ڈھونڈے کدھر دل کو ہجومِ داغِ سوزاں میں ۔۔۔ ملے کھوج ایک پروانے کا کیا اتنے چراغاں میں

کیے ہی جائیو اے دل شکایت تشنہ کامی کی ۔۔۔ رہے آب اُس کی جب تک تیغ میں خنجر میں پیکاں میں

ہدف ہے تیر کا اس کے گُلِ ہر داغِ دل میرا ۔۔۔ ہمیشہ آبِ پیکاں سے ہے شبنم اس گلستاں میں

جو لذت آشنائے مرگ ہوتا خضر تو ہرگز

نہ پیتا آبِ حیواں ڈوب مرتا آبِ حیواں میں

(22)

موت ہی سے کچھ علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو   غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو
بعد مردن ہی ترے زخمی کو راحت ہو تو ہو   جیتے جی راحت کہاں دردِ جراحت ہو تو ہو
اب زباں پر بھی نہیں آتا کبھی اُلفت کا نام   اگلے مکتوبوں میں یہ رسمِ کتابت ہو تو ہو
دستِ بخشش سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ   پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو
گر پڑے ہے آگ میں پروانہ سا کرمِ ضعیف   آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو
ہو تو ہو آباد کیوں کر یہ خرابِ آبادِ دل   عشق غارت گر اگر دنیا سے غارت ہو تو ہو
انتظارِ یار میں جو چشم ہوجائے سفید   مردمک اُس میں کہاں ہو داغِ حسرت ہو تو ہو
تلخ کامی میں ہی گزری زندگانی عمر بھر   جانِ شیریں کے دیے سے کچھ حلاوت ہو تو ہو
کہتے ہیں شورِ قیامت جس کو وہ اے چشمِ یار   تیرے مستوں کی صفیرِ خوابِ غفلت ہو تو ہو

کل جو اک پگڑی ہوئی تھی میکدے میں رہن سے
ذوق وہ تیری ہی دستارِ فضیلت ہو تو ہو

(23)

اے ذوق وقتِ نالے کے رکھ لے جگر پہ ہاتھ   ورنہ جگر کو روئے گا تو دھر کے سر پہ ہاتھ
چھوڑا نہ دل میں صبر نہ آرام نے قرار   تیری نگہ نے صاف کیا گھر کے گھر پہ ہاتھ
کھائے ہے اِس مزے سے غمِ عشق میرا دل   جیسے گرسنہ مارے ہے حلوائے تر پہ ہاتھ
خط دے کے چاہتا تھا زبانی بھی کچھ کہے   رکھا مگر کسی نے دلِ نامہ بر پہ ہاتھ
جوں پنجِ شانہ تو نہ جلا انگلیاں طبیب   رکھ رکھ کے نبضِ عاشقِ تفتہ جگر پہ ہاتھ
قاتل یہ کیا ستم ہے کہ اٹھتا نہیں کوئی   آ کر مزارِ کشتۂ تیغِ نظر پہ ہاتھ
میں ناتواں ہوں خاک کا پروانے کی غبار   اٹھتا ہوں رکھ کے دوشِ نسیمِ سحر پہ ہاتھ
اے شمع ایک چور ہے بادی یہ بادِ صبح   مارے ہے کوئی دم میں ترے تاجِ زر پہ ہاتھ

اے ذوق میں تو بیٹھ گیا دل کو تھام کر
اس ناز سے کھڑے تھے وہ رکھے کمر پہ ہاتھ

(24)

دن کتنا جائیے اب رات کدھر کاٹنے کو — جب سے وہ پاس نہیں، دوڑے ہے گھر کاٹنے کو
ہائے صیاد تو آیا مرے پر کاٹنے کو — میں تو خوش تھا کہ چھری لایا ہے سر کاٹنے کو
ہے، ابھی رات، پڑی، چار پہر کاٹنے کو — دل، ترا چاہے ہے چورنگ، اگر، کاٹنے کو
اپنے عاشق کو، نہ کھلواؤ کنی ہیرے کی — اس کے، آنسو ہی، یہ کافی ہیں، جگر کاٹنے کو
وہ شجر ہوں نہ گل و بار نہ سایہ مجھ میں — باغباں نے ہے لگا رکھا ہے، مگر کاٹنے کو

دانت، انجم ہیں، نکالے ہوئے مجھ پر، تجھ بن
منہ، فلک کھولے ہے اے رشکِ قمر کاٹنے کو

(25)

پاک رکھ اپنی زباں ذکرِ خدائے پاک سے — کم نہیں تیری زباں منہ میں ترے مسواک سے
جب بنی تیرِ حوادث کی کماں افلاک سے — عشق کا تودہ بنا انساں کی مشتِ خاک سے
جس طرح دیکھے قفس سے باغ کو مرغِ اسیر — جھانکتا ہے دل تجھے یوں دیدۂ صد چاک سے
تیرے صیدِ نیم جاں کی جاں نکلتی ہی نہیں — باندھ رکھا ہے اسے بھی تو نے کیا فتراک سے
مجھ کو دوزخ رشکِ جنت ہے اگر میرے لیے — واں بھی آتش ہو کسی کے روئے آتش ناک سے
آفتابِ حشر ہے یارب کہ نکلا گرم گرم — کوئی آنسو دل جلوں کے دیدۂ غم ناک سے
چشم کو بے پردہ ہو کس طرح نظارہ نصیب — جب کہ وہ پردہ نشیں پردہ کرے ادراک سے
بیت ساقی نامے کے لکھو کوئی جائے دعا — مے پرستوں کے کفن پر کلکِ چوبِ تاک سے

عیبِ ذاتی کو کوئی کہتا ہے حسنِ ظاہری
زیبِ بے اندام کو ہو ذوق کیا پوشاک سے

(26)

لیتے ہی دل جو عاشقِ دل سوز کا چلے — تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے
تم چشمِ سرمگیں کو جو اپنی دکھا چلے — بیٹھے بٹھائے خاک میں ہم کو ملا چلے

دیوانہ آکے اور بھی دل کو بنا چلے — اک دم تو ٹھہرو اور بھی، کیا آئے کیا چلے
ہم لطف سیر باغ جہاں خاک اڑا چلے — شوق وصال دل میں لیے یار کا چلے
غیروں کے ساتھ چھوڑ کے تم نقشِ پا چلے — کیا خوب پھول گور پہ میری چڑھا چلے
دکھلا کے مجھ کو نرگسِ بیمار کیا چلے — آوارہ مثلِ آہوئے صحرا بنا چلے
اے غم مجھے تمام شبِ ہجر میں نہ کھا — رہنے دے کچھ کہ صبح کا بھی ناشتا چلے
بل بے غرورِ حسن زمیں پر نہ رکھے پاؤں — مانندِ آفتاب وہ بے نقشِ پا چلے
کیا لے چلے گلی سے تری ہم کہ جوں نسیم — آئے تھے سر پہ خاک اڑانے اڑا چلے
کیا دیکھتا ہے ہاتھ مرا چھوڑ دے طبیب — یاں جان ہی بدن میں نہیں نبض کیا چلے
قاتل جو تیرے دل میں رکاوٹ نہ ہو تو کیوں — رُک رُک کے میرے حلق پہ خنجر ترا چلے
روزِ ازل سے زلف معنبر کا ہے اسیر — کیا اُڑ کے تجھ سے طائرِ نکہت بھلا چلے
سلجھائیں زلفیں کیا لبِ دریا پہ آپ نے — ہر موج مثل مارسیہ تم بنا چلے
دنیا میں جب سے آئے رہا عشق گل رُخاں — ہم اس جہاں میں مثلِ صبا خاک اڑا چلے
قاتل سے دخل کیا ہے کہ جاں بر ہوا پنا ہوش — گر اڑ کے مثل طائرِ رنگ حنا چلے
فکر قناعت اُن کو میسر ہوئی کہاں — دنیا سے دل میں لے کے جو حرص و ہوا چلے
اس روئے آتشیں کے تصور میں یادِ زلف — یعنی غضب ہے آگ لگے اور ہوا چلے

اے ذوق ہے غضب نگہ یار 'الحفیظ'
وہ کیا بچے کہ جس پہ یہ تیر قضا چلے

(27)

مرے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے — مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے
غرض تھی کیا ترے تیروں کو آبِ پیکاں سے — مگر زیارتِ دل کیوں کر بے وضو کرتے
عجب نہ تھا کہ زمانہ کے انقلاب سے ہم — تیمم آب سے اور خاک سے وضو کرتے
اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑیں گے — تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

سمجھ یہ دار و رسن تار و سوزن اے منصور ۔۔۔ کہ چاکِ پردہ حقیقت کا ہیں رفو کرتے

یقیں ہے صبحِ قیامت کو بھی صبوحی کش ۔۔۔ اٹھیں گے خواب سے ساقی سبو سبو کرتے

نہ رہتی یوسفِ کنعاں کی خوبیِٔ بازار ۔۔۔ مقابلہ میں جو ہم تجھ کو روبرو کرتے

سراغِ عمرِ گزشتہ کا لیجیے گر ذوق

تمام عمر گزر جائے جستجو کرتے

(28)

ساقیا عید ہے، لا بادہ سے مینا بھر کے ۔۔۔ کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینا بھر کے

آشناؤں سے اگر ایسے ہی بے زار ہو تم ۔۔۔ تو ڈبو دو انھیں دریا میں سفینا بھر کے

عقدِ پرویں ہے کہ اس عقدۂ پرویں میں فلک ۔۔۔ لائے ہیں اُس رخِ روشن سے پسینا بھر کے

دل ہے، آئینہ صفا چاہیے رکھنا اِس کا ۔۔۔ زنگ سے دیکھ نہ بھر اس میں تو کینا بھر کے

خوب اس گلشنِ رُخسار سے لے جاتے ہیں گُل ۔۔۔ اپنے دامانِ نظر، مردمِ بینا بھر کے

خُمِ پُر جوش کے مانند چھلکتا ہے مدام ۔۔۔ خونِ حسرت سے لبوں تک مرا سینا بھر کے

جام خالی بھی لگا منہ سے نہ کم ظرف کے ساتھ

ذوق کے ساتھ، قدح ذوق سے پینا بھر کے

(29)

لائی حیات، آئے، قضا لے چلی، چلے ۔۔۔ اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

ہو عمرِ خضر بھی، تو ہو معلوم وقتِ مرگ ۔۔۔ ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

ہم سے بھی، اس بساط پہ کم ہوں گے، بدقمار ۔۔۔ جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے ۔۔۔ پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

لیلیٰ کا ناقہ دشت میں تاثیرِ عشق سے ۔۔۔ سن کر فغانِ قیس، بجائے حدی، چلے

نازاں نہ ہو خرد پہ، جو ہونا ہے ہو وہی

دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

(30)

خوب روکا شکایتوں سے مجھے   تو نے مارا عنایتوں سے مجھے
واجب القتل اس نے ٹھہرایا   آیتوں سے، روایتوں سے مجھے
کہتے کیا کیا ہیں، دیکھ تو اغیار   یار تیری حمایتوں سے مجھ
وہ صریحاً تو کہہ نہیں سکتے   کہتے ہیں کچھ کنایتوں سے مجھے
کیا غضب ہے کہ دوست تو سمجھے   دشمنوں کی رعایتوں سے مجھے
دم گریہ کی نہ کر اے چشم   شوق کم ہے، کفایتوں سے مجھے
یہ بھی تقدیر کا لکھا کہ لکھیں   خط، وہ کن کن کنایتوں سے مجھے
ذکر مہر و وفا کروں تو کہے   نہیں، شوق ان حکایتوں سے مجھے
کی گریہ نے جلا مارا   ہوا نقصاں کفایتوں سے مجھے

لے گئی عشق کی ہدایت ذوق
اس گئے سب نہایتوں سے مجھے

(31)

لیا ایمان و دل تو نے اگر چہ اک زمانے سے   نہیں اس پر بھی اے کافر ترا ایماں ٹھکانے سے
ستم گر تو نے روکا سب کو میرے پاس آنے سے   اجل بھی اب یہاں آوے تو شاید کچھ بہانے سے
نہ میں فوارہ ہوں، نے شمع لیکن سامنے اس کے   بہانے، مجھ کو جا کر اپنے آنسو ہر بہانے سے

پڑے، تسبیح زاہد پہ نگاہ مست، گر تیری
تو ٹپکے بادۂ انگور، اس کے دانے دانے سے

(32)

یہ اقامت، ہمیں پیغام سفر، دیتا ہے   زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے
زال دنیا ہے عجب طرح کی، علامۂ دہر   مرد دیں دار کو بھی دہریہ کر دیتی ہے
بڑھتی جاتی ہے، جو مشق ستم، اس ظالم کی   کچھ محبت مری، اصلاح، مگر دیتی ہے

فائدہ دے ترے بیمار کو کیا خاک دوا — اب تو اکسیر بھی دیجیے تو ضرر دیتی ہے
شمع گھبرا نہ شبِ غم سے، کہ کوئی دم میں — تجھ کو، کافورِ سفیدیٔ سحر، دیتی ہے
غنچہ ہنستا ہے، ترے آگے جو گستاخی سے — چٹکنا منھ پہ وہیں بادِ سحر، دیتی ہے
شمع بھی کم نہیں کچھ، عشق میں پروانے سے — جان دیتا ہے، اگر وہ، تو یہ سر دیتی ہے
دم بہ دم، زخم پہ اک زخم ہے، دم لینے کی — مجھ کو فرصت نہیں، وہ تیغِ نظر، دیتی ہے
دیتی شربت ہے، کسے زہر بھری آنکھ، تری — عین احسان ہے وہ زہر بھی گر دیتی ہے
کوئی غماز نہیں، میری طرف سے، اے ذوق
کان اُس کے، مری فریاد ہی، بھر دیتی ہے

(33)

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
تم نے ٹھیرائی، اگر غیر کے گھر جانے کی — تو ارادے یہاں کچھ اور ٹھہر جائیں گے
خالی اے چارہ گرو! ہوں گے بہت مرہم دان — پر مرے زخم، نہیں ایسے کہ بھر جائیں گے
پہنچیں گے رہ گزرِ یار تلک، کیونکر ہم — پہلے جب تک نہ دو عالم سے گزر جائیں گے
شعلۂ آہ کو بجلی کی طرح چمکاؤں — پر مجھے ڈر ہے کہ وہ دیکھ کے ڈر جائیں گے
ہم نہیں وہ جو کریں خون کا دعویٰ تجھ پر — بلکہ پوچھے گا، خدا بھی، تو مکر جائیں گے
آگ دوزخ کی بھی، ہو جائے گی، پانی پانی — جب یہ عاصی عرقِ شرم سے تر جائیں گے
نہیں پائے گا، نشاں، کوئی، ہمارا، ہرگز — ہم جہاں سے روشِ تیرِ نظر جائیں گے
ذوق جو مدرسے کے بگڑے ہوئے ہیں ملّا
ان کو میخانے میں لے آؤ سنور جائیں گے

(34)

غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے — جلتے ہیں مگر تیری ہنسی کو نہیں پاتے
ہم تم ساعدو اپنا، کسی کو نہیں پاتے — تم پاتے ہو ہم کو، تو چھری کو نہیں پاتے

دل ہم نے دیا کیوں تجھے اے سنگ دل اپنا	کم بخت ہم اُس سخت گھڑی کو نہیں پاتے
وہ کون سا غم ہے جسے پاتے نہیں، دل میں	لیکن نہیں پاتے تو خوشی کو نہیں پاتے
رکھتے ہیں، دمِ شعلہ فشاں، اژدرِ دوزخ	لیکن مری آتش نفسی کو نہیں پاتے
ہم وصل کی شب، لیتے ہیں، یہ بوسہ، کہ لب پر	ذرّہ بھی سحر رنگِ مسی کو نہیں پاتے
بل بے تری گرمی کہ اب اے سوزِ محبت	ہم نام کو، آنکھوں میں، نمی کو نہیں پاتے
میں ایسا کہیں گم ہوں کہ یارانِ عدم بھی	گم ہو کے مری گم شدگی کو، نہیں پاتے

معلوم نہیں اُس کے دہن ہے کہ نہیں ہے
اے ذوق ہم اس سرِّ خفی کو نہیں پاتے

(35)

ہے کان اُس کے زلفِ معنبر لگی ہوئی	چھوڑے گی یہ نہ بال برابر، لگی ہوئی
میرے دلِ گرفتہ کی واشد، ہو کس طرح	ہیہات، یاں گرہ ہے، گرہ پر لگی ہوئی
کھٹکے گی، بعد مرگ بھی، اس کی مژہ کی نوک	وہ پھانس ہے کلیجے کے اندر، لگی ہوئی
میت کو غسل دیجو نہ، اس خاکسار کی	ہے تن پہ خاکِ کوچۂ دلبر لگی ہوئی
چاٹے بغیر، خوں کوئی رکتی ہے، تیری تیغ	بے ڈھب، ہے اس کو چاٹ، ستمگر لگی ہوئی
بیٹھے ہیں دل کے بیچنے والے ہزار ہا	گزری ہے اس کی راہ گزر پر لگی ہوئی
عیسیٰ اگرچہ پاس ہے، ممکن نہیں شفا	خورشید کو، وہ تپ، ہے فلک پر، لگی ہوئی
کرتی ہے، زیرِ برقعِ فانوس، تاک جھانک	پروانے سے ہے، شمع مکرر، لگی ہوئی
یہ چاہتا ہے شوق کہ قاصد بجائے مہر	آنکھ اپنی، ہو لفافۂ خط پر لگی ہوئی
گُل مہندی، کیوں نہ باغ میں، ہو پائمالِ رشک	پاؤں میں تیرے دیکھے، حنا، گر لگی ہوئی
بیٹھے، بھرے ہوئے ہیں خُمِ مے کی طرح ہم	پر کیا کریں کہ مہر ہے منھ پر لگی ہوئی
منہ سے لگا ہوا ہے، اگر جامِ مے، تو کیا	دل سے ہے، یادِ ساقیِ کوثر، لگی ہوئی

اے ذوق اتنا دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی

(36)

خط بڑھا، کاکل بڑھے، زلفیں بڑھیں، گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں، جتنے بڑھے، ہندو بڑھے

تیرے جلوے سے، چمن کی رونق، اے گل رو، بڑھے
شاخِ گلبن میں، بڑھے گل، گل میں رنگ و بو بڑھے

بعد، رنجش کے، گلے ملتے ہوئے، رکتا ہے، جی
اب مناسب ہے، یہی، کچھ میں بڑھوں، کچھ تو بڑھے

دشت میں، مجنوں سے ملنے کو، بڑھائے ہم نے ہاتھ
ضعف سے مدت میں، جوں شاخِ سرآہو بڑھے

یوں، دمِ گریہ ہوا، دل سے مرے، نالہ بلند
جس طرح، پانی کے باعث، سروِ آبِ جو بڑھے

چاہتا ہے، حسن کے دیواں میں، خطِ پشتِ لب
ایک مطلع اور، زیرِ مطلعِ ابرو، بڑھے

بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی، وحشت، وگرنہ پہلے تو
ہاتھ کے ناخن بڑھے سر کے ہمارے مو بڑھے

تجھ کو دشمن، وہاں شرارت سے، جو جڑ کاٹے ہیں، روز
چاہتے ہیں اور شر، اے شوخ آتش خو، بڑھے

پاس ہے، ساقی، ترے، وہ دارو ئے فرحت فزا
جس کے اک قطرے سے، سیروں جسم میں لاہو بڑھے

پیشوائی کو، غمِ جاناں کی، چشم و دل سے، ذوق
جب بڑھے نالے تو ان سے بیشتر آنسو بڑھے

(37)

ہم ہیں اور شغلِ عشق بازی ہے
کیا حقیقی ہے کیا مجازی ہے

دخترِ رز نکل کے، مینا سے
کرتی، کیا کیا زباں درازی ہے

خط کو کیا دیکھتے ہو آئینے میں
حسن کی یہ ادا طرازی ہے

ہندوئے چشم طاقِ ابرو میں
کیا بنا، آن کر نمازی ہے

نذر دیں، نفس کش کو، دنیا دار
واہ کیا تیری بے نیازی ہے

بتِ طناز ہم سے ہو، ناساز
کارسازوں کی کارسازی ہے

سچ کہا ہے، کسی نے یہ، اے ذوق
مالِ موذی نصیبِ غازی ہے

(38)

کب حق پرست زاہدِ جنت پرست ہے حوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے
دل صاف ہو تو چاہیے معنی پرست ہو آئینہ خاک صاف ہے صورت پرست ہے
درویش ہے وہی جو ریاضت میں چست ہو تارک نہیں فقیر بھی راحت پرست ہے
جز زلف سوجھتا نہیں اے مرغِ دل تجھے خفاش تو نہیں ہے کہ ظلمت پرست ہے
دولت کی رکھ نہ مارِ سرِ گنج سے اُمید موذی وہ دے گا کیا کہ جو دولت پرست ہے
عنقا نے گم کیا ہے نشاں نام کے لیے گم گشتہ کون کہتا ہے شہرت پرست ہے
یہ ذوق مے پرست ہے یا ہے صنم پرست
کچھ ہے بلا سے لیک محبت پرست ہے

(39)

سب کو دنیا کی ہوس خوار لیے پھرتی ہے کون پھرتا ہے یہ مردار لیے پھرتی ہے
گھر سے باہر نہ نکلا کبھی اپنے خورشید ہوسِ گرمیٔ بازار لیے پھرتی ہے
وہ مرے اخترِ طالع کی ہے واژوں گردش کہ فلک کو بھی نگوں سار لیے پھرتی ہے
کر دیا کیا ترے ابرو نے اشارہ قاتل کہ قضا ہاتھ میں تلوار لیے پھرتی ہے
جا کے اک بار نہ پھرنا تھا جہاں، واں مجھ کو
بے قراری ہے کہ سو بار لیے پھرتی ہے

قصائد

(1)

پیری میں پر ضرور ہے جامِ شرابِ ناب
پائے فروغِ صبح، نہ بے نورِ آفتاب

تائب نہ ہو تو اس سے کہ ڈاڑھی ہوئی سفید
کر خوب مے کشی کہ یہ ہے سیرِ ماہ تاب

ہے پیرِ دل خنک کی ہوا پر بقائے عمر
یہ برف وہ نہیں جسے رکھیں نمد سے داب

ہستی کا اپنی کر نہ بھروسا حباب دار
تعمیرِ بے بنا ہے یہ اور خیمہ بے طناب

آئی ہے جب سے قالبِ خاکی میں تیری جان
غافل پئے سفر ہے اسی دن سے پاتراب

جو دم مزے سے گزرے غنیمت سمجھ اُسے
گردش ہے آسماں کو زمانے کو انقلاب

ہر بازیِ فلک پہ تو نو روز، روز کر
رکھ آفتاب گنجفہ پر سال کا حساب

حاصل ہے کیا ہنر سے، ولا آئینے کو دیکھ
جوہر سے دل میں رکھتا ہے کیا کیا وہ پیچ وتاب

گر ہو سکے تو خاکِ درِ مے کدہ ہو تو
اس خاک داں میں تا نہ ہو مٹی تری خراب

آسودگانِ کنجِ خرابات کے لیے
جانا بہشت تک بھی ہے دوزخ کا اک عذاب

یاں تک ہیں بے دماغ نہ بولیں گے منہ سے وہ
دے گا جواب نامہ نکیرین کو جواب

رکھتا ہے چرخ اہلِ سعادت کو بد مذاق
گزران ہے ہما کی سرِ روزیِ کلاب

دیکھے جہاں کو دیدۂ عبرت سے تو اگر
جامِ جہاں نما ہے ہر اک کاسۂ حباب

ساقی جو تجھ کو عینِ عنایت سے جام دے
لے اور لگا کے آنکھوں سے جا جا اسے شتاب

گر بے حساب جام پہ جام آئیں تیرے ہاتھ
روزِ حساب تک تو پیے جا علی الحساب

مستی میں ایسا مطلعِ تازہ کوئی سنا
جامی بھی لکھے دل پہ جسے کر کے انتخاب

گلشن کو دے جو گریۂ مستانہ میرا آب
بیضوں سے بلبلوں کے ہو پیدا بطِ شراب

گل گونِ نغمہ سے گل گوں پہ ہو مرا
پابوسِ آسماں روشِ حلقۂ رکاب

مستی مری سکھائے اگر جھومنے کی طرز
ٹپکے ہمیشہ ابر سے مستی بجائے آب

بے ہوشیوں میں ہیں مری وہ گرم جوشیاں
ہوتے ہیں جس سے طائرِ ہوش و خرد کباب

جاگ اٹھیں وہ جو خواب عدم میں ہیں ہوشمند مستی میں گر بلند ہو میری صفیرِ خواب

یہ پردہ فلک کو اٹھاؤں اک آن میں ہو جاؤں میں جو عالمِ مستی میں بے حجاب

ہو وہ صواب دیدِ فلاطوں میں خم نشیں کہہ بیٹھوں گر نشے میں کوئی حرف ناصواب

یہ ذہن کو ہے عالمِ مستی میں روشنی ہر خشتِ خم ہے حکمتِ اشراق کی کتاب

ہر روز جامِ بادۂ روشن کا مجھ کو شغل ہے مثلِ شغلِ آئینہ و شغلِ آفتاب

پرہیز یہ مرا ہے کہ تقوے سے ہے گریز تقویٰ ہے میرا یہ، کہ ہے توبہ سے اجتناب

لیکن ہے ابرِ رحمتِ باری سے درفشاں دامانِ تر مرا، روشِ دامنِ سحاب

مداح ہوں میں اس کا کہ ہے جس کے دور میں شیبِ زمانہ کے لیے کیفیتِ شباب

پیرِ فلک بنے ہے جوانِ سیاہ مست ریشِ شعاعِ مہر پہ ہے ابر سے خضاب

مانندِ نافِ آہو اگر جام میں ہو بوں اس کی شمیمِ فیض سے، ہو جائے مشک ناب

یا اس شاہ کے نمِ کرم و بوئے خلق سے ہر خار بن ہو ہمسرِ فوارۂ گلاب

وہ بادشاہ جس کا بہادر شہ اسمِ پاک ہے ذرِ جلبِ زمانہ کا یکتا درِ خوش آب

ظل اللہ خسرو دیں دار، دیں پناہ شاہِ بلند جاہ و خدیو فلک جناب

تیغ اس کی وہ ظفر دم و نصرت اثر کہ ہے گنجِ ہزار فتح کی مفتاحِ فتحِ باب

روشن دلی سے اس کی عدو تیرہ بخت ہے دزدِ سیاہ کار کو آفت ہے ماہتاب

ہر مغزِ جانِ کافرِ نعمت کے واسطے مطبخ میں اس کے پختۂ نمرود ہو رباب

ہے ابر میں بھی برق کا شعلہ مگر نہیں اس میں دمِ وفورِ عطا گرمیٔ عتاب

کج خلقی اس کی طبعِ رواں میں نہیں ذرا دریائے موج زن کو ہزاروں ہیں پیچ و تاب

پڑھتا ہوں میں وہ مطلعِ روشن حضور میں
جس کا نہ ہووے مطلعِ خورشید بھی جواب

شاہا تو وہ ہے نورِ مجسم کہ آفتاب کرتا ہے نور کو، ترے سائے سے اکتساب

تلوار تیری ہے، وہ غضب، برقِ کفر سوز ہے جس کی آنچ آتشِ دوزخ کا التہاب

جوہر سے تیری تیغ کے دکھلائے ہے قضا ــ سرکش کو لکھ کے حرف بحرف آیتِ عذاب

اللہ رے پاس داری اسلام و پاسِ شرع ــ اللہ رے تیری مصلحت، اللہ رے احتساب

انگور زخم دل پہ نہ بدخواہ کے بندھے ــ اس خوف سے کہ ہوتی ہے انگور کی شراب

کیسا ہی مے پرست ہو مانندِ چشمِ یار ــ مقدور کا، کرے قدحِ مے کا ارتکاب

بلکہ نہ لے دعائے قدح کا بھی منھ سے نام ــ بالفرض گر وہی ہو دعاؤں میں مستجاب

شاہا تری حمایت و دولت کے سائے میں ــ کنجشک، رشکِ باز ہے، رشکِ ہما غراب

کرتا ہے روز و شب کو برابر شہنشہا ــ میزانِ عدل سے تری میزاں میں آفتاب

خورشید کھینچتا ہے جو برجِ اسد پہ تیغ ــ چاہے ہے، شیر جنگ، وہ تجھ سے کرے خطاب

پہنچے ترے تکلم شیریں کو شہد کیا ــ یہ شربتِ خضر ہے شہا وہ قے زباب

چالاکی ایسی تو سنِ چالاک میں ترے ــ شوخی ہے چشمِ یار میں عاشق میں اضطراب

کاوے میں یوں وہ جیسے کہ طاؤس وقتِ رقص ــ اڑنے میں یوں وہ جیسے کہ پرواز میں عقاب

چکائے اک ذرا سرِ میداں جو تو اسے ــ بے پر ہوا پہ جائے وہ جوں ناوکِ شہاب

کرتا ہے یوں ثنا کو دعا پر وہ اختصار ــ یارب دعائے ذوق ہو مقبول و مستجاب

تا عید و عیدگاہ اور خطبہ و نماز ــ تا خطبہ و نماز سے منظور ہو ثواب

ہر سال تجھ کو عید ہو فرخ بہ عز و جاہ ــ ناکام ہوں عدو ترے اور دوست کام یاب

(2)

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر ــ عیاں ہو خامے سے، تحریرِ نغمہ جائے صریر

زباں سے ذکر اگر چھیڑیے، تو پیدا ہو ــ نفس کے تار سے، آواز خوش تر از بم و زیر

ہوا یہ باغِ جہاں میں شگفتگی کا جوش ــ کلیدِ قفلِ دلِ تنگ و خاطرِ دل گیر

کرے ہے وا لبِ غنچہ، دو ہزار سخن ــ چمن میں، موجِ تبسم کی کھول کر زنجیر

کچھ انبساط ہوائے چمن سے دور نہیں ــ جو وا ہو غنچہ منقارِ بلبلِ تصویر

قفس میں بیٹھ کے بھی شوقِ نغمہ سنجی سے ــ عجب نہیں کہ ہو مرغِ چمن، بلند صفیر

اثر سے بادِ بہاری کے، لہلہانے میں زمیں پہ، ہم سر سنبل ہے موجِ نقشِ حصیر
نکل کے سنگ سے، گر ہو شرارہ تخم فشاں تو سبز، فیضِ ہوا سے ہو، وہ بہ رنگِ شعیر
زمیں پہ گرتے ہی، لے آئے دانہ، برگ و ثمر جو ٹوٹے ہاتھ سے زاہد کے سبحۂ تزویر
ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ کہ جیسے جائے کوئی فیلِ مست، بے زنجیر
نہ خارِ دشت ہے، نرمی میں خوابِ مخمل ہے ہر ایک تارِ رگِ سنگ بھی ہے تارِ حریر
ہوا میں ہے یہ طراوت، کہ دودِ گلخن بھی برستا اٹھے ہے آتش سے مثلِ ابرِ مطیر
یہ آیا جوش میں، بارانِ رحمتِ باری کہ سنگ سنگ میں سنگِ یدہ کی ہے تاثیر
ہر ایک خار ہے گل، ہر گل ایک ساغرِ عیش ہر ایک دشت چمن، ہر چمن بہشت نظیر
ہر ایک قطرۂ شبنم گہر کی طرح خوش آب ہر اک گہر، گہرِ شب چراغ، پر تنویر
کرے ہے صبح شکر خندہ، اس مزے کے ساتھ کہ جس طرح بہم آمیختہ ہوں شکر و شیر
سنوارتی ہے، جو شام اپنی زلفِ مشکیں کو سوادِ مشکِ ختن پر، ہے لاکھ آہو گیر
نہالِ شمع سے ہر شب، چنے گلِ شبو بہارِ عیش میں، گلچیں کی طرح سے گل گیر
ہنسے چراغ، تو ایسے ہنسی میں، پھول جھڑیں حیا سے، رنگِ گلِ آفتاب، ہو تغییر
رہے ہے چرخ پہ ہر صبح، جوں صبوحی کش یہ ایں درازیِ ریشِ آفتاب ساغر گیر
عجب نہیں ہے کہ آرائشِ زمانہ سے حنائی پنجے ہوں، تاک و چنار و بید انجیر
چمن میں ہے یہ درختانِ سبز پر، جوبن کہ زہر کھاتے ہیں، سبزانِ خطۂ کشمیر

نہ کیوں کہ دیکھ کے گلشن کو یہ پڑھوں مطلع
کہ آئے ہے نظر، اک قدرتِ خدائے قدیر

مطلع ثانی

ظہورِ نرگس و گل، جلوۂ سمیع و بصیر نسیم و نکہتِ گل، مظہرِ لطیف و خبیر
شمیمِ عیش سے، ہے یہ زمانہ عطر آگیں کہ قرصِ عنبر اگر ہے زمیں، تو گرد عبیر
حمل سے حوت تلک، جا بہ جا ہیں تصویریں بنا ہے عالمِ بالا بھی، عالمِ تصویر
جہاتِ ستہ سے، بزمِ جہاں ہے وسعت خواہ کہ ہے ہجومِ نشاط و سرورِ جم غفیر

زمانہ دشمنِ عشرت کا اس قدر قاتل — مہ صیام کو، دیکھے نہ کوئی بے شمشیر

ہوا ہے مدرسہ، یہ بزم گاہِ عیش و نشاط — کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں "بدر منیر"

اگر پیالہ ہے "صغریٰ" تو ہے سبو "کبریٰ" — "نتیجہ" یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

زمین میکدہ یہ خندۂ نشاط انگیز — کہ لائے مے سے، ہو دیوارِ قہقہہ، تعمیر

دیا ہے رنج کو دھو تیرے غسلِ صحت نے — ضمیرِ خلق سے، اے بادشاہِ پاک ضمیر

عجب نہیں یہ ہوا سے کہ مثلِ نبضِ صحیح — کرے اگر حرکت موجِ چشمۂ تصویر

شہنشاہا! ترے یمنِ شفائے کامل سے — جو لاعلاج مرض تھے، وہ ہیں علاج پذیر

کہ چوبِ گل کو اگر ماریں بیدِ مجنوں پر — تو صورتِ بشر ہوش مند، خوش تقریر

اشارہ فہم ہو ایسا کہ وہ بیان کرے — زبان برگ سے، گونگے کے خواب کی تعبیر

جو میلِ کحلِ بصارت ہو کلکِ خطِ غبار — تو چشم دائرہ عین بھی، ہو چشم بصیر

نہ موج سے کو ہو پیچش، نہ شیشہ لے ہچکی — گئی جہاں سے یہ بیماری فواق و زحیر

نہ برق کو تپِ لرزہ، نہ ابر کو ہو زکام — نہ آب میں ہو رطوبت، نہ خاک میں تبخیر

بدل گئی ہے حلاوت سے تلخیٔ دارو — شرابِ تلخ بھی ہو، مے کشوں کو شربت و شیر

قوی ہے قوتِ تاثیر سے دوا اے طبیب — غنی قبول کی دولت سے ہے دعائے فقیر

(قطعہ)

شکستِ دل کو ترے، یمن تندرستی سے — کرے درست، اگر مومیائی تدبیر

تو موئے کاسۂ چینی کو، چارہ سازِ قضا — نکالے کاسۂ چینی سے مثلِ موئے خمیر

کھجائے سر جو کبھی مفسدانِ سرکش کا — علاجِ خارشِ سر ہو، بہ ناخنِ شمشیر

بنا ہے، نقشِ شفا خانۂ ہزار شفا — ہر ایک خانۂ تعویذ صاحبِ تکبیر

ہر ایک اسم، عزیمت میں، اسمِ اعظم ہے — ہر ایک نسخہ، شفا میں ہے، نسخۂ اکسیر

رہا نہ کوئی، گرفتارِ رنج، عالم میں — چھٹے، جو تیرے تصدق میں، مجرمانِ اسیر

شہا ہے دم سے ترے، زندگانیٔ عالم — یہ تیرا دم ہے، وہ اعجازِ عیسوی تاثیر

مثالِ خضر، تو اے رہنمائے [illegible] و دیں — جہاں میں پیر ہو، پر ہو کرامتوں سے پیر

تو ہے وہ، حامیِ دنیا و دیں زمانے میں — کہ تجھ سے زیب ہے دنیا کو، دین کو توقیر
کیا شہانِ سلف نے، مسخر ایک جہاں — کیے ہیں تو نے شہنشاہ، دو جہاں تسخیر
سحر سے شام تلک، زرفشاں ہے، پنجۂ مہر — نثار کرتا ہے، ہر روز ایک گنجِ خطیر
فلک پہ کرتا ہے، ہر شب ادا جو سجدۂ شکر — نشانِ سجدہ ہے، زیبِ جبینِ ماہِ منیر

یہ روز بہ سے ترے ہے جواں جہانِ کہن
کہے نہ کوئی دوشنبے کو بھی، جہان میں پیر

(قطعہ)

حیات بخش جہاں، تیرا مژدۂ صحت — جو بخشے، خلق کو، عمرِ طویل و عیشِ کثیر
ہزاروں سال، سرِ ہر صدی نکال کے دانت — ہنسیں اجل پہ، جوانوں کی طرح مردم پیر
جہاں کو یوں تری صحت کے ساتھ ہے صحت — صحیح، جیسے کہ قرآن، ہو مع تفسیر
یہ وہ خوشی ہے کہ فربہ ہوں، جس سے روز بروز — ہلال بست و نہم کی طرح بدن کے حقیر
پڑھوں ثنا میں تری اب وہ مطلعِ روشن — کہ جس کا مطلعِ خورشید بھی نہ ہووے، نظیر

مطلع ثالث

شہنشہا! وہ تری روشنیِ رائے منیر — عقولِ عشرہ، کے انوار جس کے عشرِ عشیر
جو ہو نہ، تابعِ امر "تشاور فی الامرْ" — تو عقلِ کل کو کرے تو نہ ہرگز اپنا مشیر
جو ہیں نکات و معانی بشر کی فہم سے دور — وہ تیرے ذہن میں، موجود سب قلیل و کثیر
اگر ہے، سہو کو کچھ دخل، حافظے میں، تو یہ — نہ اپنا یاد ہے احساں، نہ اور کی تقصیر
جو ہے حیا متعلق، تری نگاہ کے ساتھ — تو ہے، صفائی کی جانب، تری صفا کی ضمیر
ترا تو سیۂ بھی، یوں ہے داخلِ حسنات — کہ جیسے صحبتِ اصحابِ کہف میں، قطمیر
کرے ہے سلب تغیر کو ذات حادث سے — زمانہ عدل سے تیرے، یہ اعتدال پذیر
مجال کیا کہ ترے عہد میں، شرر کی طرح — اٹھائیں، سر کو شرارت سے سرکشانِ شریر
ہوا میں آکے، جو کرتا ہے سرکشی، شعلہ — تو چٹکیاں، دلِ آتش میں لے ہے، آتش گیر
ترے نسق سے، جو بالکل رہی نہ خوں ریزی — لڑائیوں میں، کہیں، پھوٹتی نہیں نکسیر

جو پہنچے بت کدے میں تیرا شورِ دیں داری — بلند، نالۂ ناقوس سے بھی، ہو تکبیر
کیا، یہ کفر کو، اسلام نے ترے، معدوم — کہ کوئی زلفِ بتاں پر، نہ کر سکے، تکفیر
جہاں میں چشمِ سیہ مستِ یار کا، ہو یہ رنگ — جو مے کشوں کو، ترا احتساب دے، تعزیر
پڑے گلے میں رسن خطِ سرمہ سے، اس کے — رہے، مدام وہ گردش میں، از پئے تشہیر
وہ برقِ قہرِ خدا، تیری تیغِ آتش دم — کہ جس کی آنچ، ترے دشمنوں کو نارِ سعیر
جو ہے خدنگ کا تیرے، نشانہ، چشمِ حسود — تو ہے تفنگ کا تیرے، دلِ عدو نخچیر
ترے نہیب سے ہوں، شکلِ فلس ماہی الگ — کریں نہ حلقۂ جوہر رفاقتِ شمشیر

جو تیر نکلے، کماں سے تری، وہ ہو جائے
طلب میں، جانِ عدو کی رواں قضا کا سفیر

ق

ترے ہے، خامۂ طغرا نگار میں، یہ زور — جو کھینچے، اک، روشِ خطِ منحنی، وہ لکیر
تو اس سے، ایسے ہوں، اشکالِ ہندسی پیدا — مٹا دے، دیکھ کے اُقلیدس اپنی سب تحریر

ق

وہ روشنی، ترے خط میں کہ ابنِ مقلہ، اگر — لگائے آنکھوں سے، سرمے کی جا، تری تحریر
تو ہو یہ نورِ بصارت کہ پڑھ لے حرف بہ حرف — جو ہووے، لوحِ جبیں پر، نوشتۂ تقدیر

ق

ترا سمند ہے، وہ تیز رو، کہ وقتِ خرام — نظر ہو، دیدۂ زرقا کی بھی، نہ اس کا نظیر
کہ سیرگاہِ دو عالم، تو راہِ یک روزہ — اور اس کا شرق سے تا غرب عرصہ گاہِ مسیر
ترے جو فیل کی تعریف، خسروا لکھوں — کروں، حکایتِ شیریں و کوہ کن، تحریر
کہ فیل کوہ، کجک تیشہ، فیل باں، فرہاد — وہ دونوں دانت، صفا ایک ایک جوئے شیر

ق

چلے نہ، اشرفی آفتاب، عالم میں — خطِ شعاع سے اس پر، جو ہو نہ یہ، تحریر
"ابو ظفر، شہِ والا گہر، بہادر شاہ — سراجِ دینِ نبی، سایۂ خدائے قدیر

شہ بلند نگہ، شہریار والا جاہ ۔ خدیو مہر کلہ، خسروِ سپہر سریر
رقم میں گر ترے انصاف کی قصور کرے ۔ زبانِ خامہ، عطارد کی ناک میں، دے تیر
زمیں ہو سبز، جو تیرے سحابِ بخشش سے
تو بوٹی بوٹی سے، ہر خاک کی بنے، اکسیر

ق

بہ چشم مہر، اگر تیرا نیّرِ اقبال ۔ کرے نگاہ، سرِ آب جو و آبِ غدیر
تو فلس فلس سے ہو، ماہیوں کے، وقتِ شکار ۔ نگینِ دستِ سلیماں بدستِ ماہی گیر
نہ ہے ثنا کے لیے تیری، اختتام و تمام ۔ نہ ہے دعا کے لیے تیری، انتہا و اخیر
مگر یہ ذوقِ ثنا سنج و مدح خواں تیرا ۔ غلام، پیر کہن سال، اک فقیرِ حقیر
کرے ہے دل سے دعا، یہ سوا فقیرانہ ۔ سنا ہے، جب سے کہ رحم خدا دعائے فقیر
الٰہی! آب پہ ہو، تا زمیں، زمیں کو ثبات ۔ زمیں پہ، تا ہو فلک اور فلک کو ہو تدویر
فلک پہ چھوڑے، نہ تا دامنِ مسیح، حیات ۔ زمیں پہ خضر کی تا ہو فنا، نہ دامن گیر
عطا کرے تجھے، عالم میں قادرِ قیوم ۔ بہ جاہ و دولت و اقبال و عزت و توقیر
تنِ قوی و مزاجِ صحیح و عمرِ طویل ۔ سپاہِ وافر و ملکِ وسیع و گنجِ خطیر
جہاں مسخر و عالم مطیع و خلق مُطاع
فلک مؤید و اختر معین و بخت نصیر

(3)

ہے آج جو یوں خوش نما، نورِ سحر رنگِ شفق ۔ پرتو ہے، کس خورشید کا، نورِ سحر رنگِ شفق
یہ جوشِ نسرینِ دمن، یہ لالہ و گل کا چمن ۔ گلشن میں گویا چھا گیا نورِ سحر رنگِ شفق
ہر سرو قد غنچہ دہن، زیبِ چمن شانِ چمن ۔ ہر سیم بر گلگوں قبا نورِ سحر رنگِ شفق
افشاں جبیں پر، سربسر مہتاب و انجم جلوہ گر ۔ اور گورے ہاتھوں میں حنا، نورِ سحر رنگِ شفق
لب پر تبسم ہے کہ ہے، جوشِ بہار و موجِ گل ۔ دندانِ پاں خوردہ ہیں یا نورِ سحر رنگِ شفق
ہر مجمعِ پیر و جواں، اک طرفہ مشرق ہے کہ واں ۔ روشن دل و رنگیں ادا، نورِ سحر رنگِ شفق

جامِ بلوریں میں ہے یوں عکسِ شراب لالہ گوں ہو جیسے کیفیت فزا نورِ سحر رنگِ شفق
حسنِ گُلِ مہتاب نے، جوشِ گُلِ سیراب نے کیا باغ میں چمکا دیا، نورِ سحر رنگِ شفق
دیکھے، چمن میں برگِ گل، آلودہ شبنم سے جو کل خجلت سے پانی ہوگیا، نورِ سحر رنگِ شفق
ہے شوق کو بالیدگی، ہے ربط کو چسپیدگی کس رنگ ہوں مل کر جدا نورِ سحر رنگِ شفق
ساقی مئے عشرت سے بھر ساغر کہ ہے اس رنگ پر آب و ہوا جائے فضا نورِ سحر رنگِ شفق
جشنِ بہادر شاہ ہے، روزِ علوئے جاہ ہے ہے اس لیے بہجت فزا، نورِ سحر رنگِ شفق
وہ خسروِ روشن گہر جس کو خجل ہوں، دیکھ کر ماہ و ثریا و سہا، نورِ سحر رنگِ شفق

اک صاف مطلع میں لکھوں اور وہ ثنا سے رنگ دوں
ہو دیکھ کر غرقِ حیا نورِ سحر رنگ شفق

مطلع ثانی

روکش ہو تیرے رُخ سے کیا نورِ سحر رنگِ شفق ذرّہ ہے، تیرے فیض کا، نورِ سحر رنگِ شفق
اے آفتابِ عزّ و شاں، تیری جبیں سے ہے عیاں نورِ یقیں رنگِ حیا، نورِ سحر رنگِ شفق
روشن بیانی سے تری رنگیں کلاہی سے تری شرمندہ ہوتا ہے سدا نورِ سحر رنگِ شفق
وہ سیم گوں ایواں ترا، وہ سائباں رنگیں کھنچا لیں وام، اب جس سے صفا، نورِ سحر رنگِ شفق
فانوسِ شیشہ لعل گوں، روشن تری محفل میں یوں گویا کہ شیشے میں بھرا، نورِ سحر رنگِ شفق
انصاف نے تیرے شہا، سیماب و آتش کو کیا یوں جمع، جیسے ایک جا، نورِ سحر رنگِ شفق
تیری اماں و حفظ سے، ہو جائے حق میں شمع کے نارِ خلیل آبِ بقا، نورِ سحر رنگِ شفق
خورشید تجھ سے فیض کو پہنچے تو مشرق میں نہ ہو بر درّ و لعلِ بے بہا، نورِ سحر رنگِ شفق
جس پر کہ تو ہووے غضب، ہو اسکے حق میں کیا عجب سیلِ فنا برقِ بلا، نورِ سحر رنگِ شفق
شمشیر کی تیری چمک خونِ عدو سے یک بہ یک دکھلائے ہے روزِ وغا، نورِ سحر رنگِ شفق
پیکان تیرا، لالہ گوں، منھ، سرخ سوفاروں کے یوں گویا لگا کر پر اڑا، نورِ سحر رنگِ شفق
جلوہ ہے تیری مہر کا، شعلہ ہے تیرے قہر کا ہے جس کو، عالم جانتا، نورِ سحر رنگِ شفق
اسپِ حنا بستہ ترا وہ نقرہ خنگِ باد پا غیرت سے جس کی اُڑ گیا نورِ سحر رنگِ شفق

اب ذوق کی ہے یہ دعا جب تک رہے شاہنشہا　　خورشید و مہ، ارض و سما، نورِ سحر رنگِ شفق
جب تک لباسِ دہر کو، صابون اور شجرف ہو　　زینت دہ صبح و مسا، نورِ سحر رنگِ شفق
جشنِ فرخ ہو تجھے، اس طرح آب و تاب سے　　ہوں تیرے محتاجِ ضیا، نورِ سحر رنگِ شفق

دشمن کا تیرے، منہ ہو فق اور خوں بہے دل ہو کے شق
دیکھے، نہ وہ اس کے سوا نورِ سحر رنگِ شفق

(4)

ساون میں، دیا پھر مہِ شوال، دکھائی　　برسات میں عید آئی، قدح کش کی بن آئی
کرتا ہے ہلال، ابروے پُرخم سے اشارہ　　ساقی کو کہ بھر بادے سے، کشتی طلائی
ہے عکس فگن، جام بلوریں سے، مئے سرخ　　کس رنگ سے ہوں، ہاتھ نہ مے کش کی حنائی
کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشے میں　　ساقی نے ہے، آتش سے، مئے تیز اڑائی
یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے　　ہووے نہ ممیّز کرۂ ناری و مائی
پہنچا کنکِ لشکرِ باراں سے ہے، یہ زور　　ہر نالے کی ہے دشت میں، دریا پہ چڑھائی
ہو قلزمِ عماں پہ، لب جو متبسّم　　تالاب، سمندر کو کرے، چشم نمائی
ہے کثرتِ باراں سے ہوئی عام، یہ سردی　　کافور کی تاثیر، گئی جو زمیں پائی
سردیِ حنا پہنچے ہے، عاشق کے جگر تک　　معشوق کا، گر ہاتھ میں ہے دستِ حنائی
عالم یہ ہوا کا ہے کہ تاثیر ہوا سے　　گردوں پہ ہے، خورشید کا بھی، دیدہ ہوائی
کیا صرف ہوا ہے، طرب و عیش سے عالم　　ہے، مدرسے میں بھی، سبق صرفِ ہوائی
خالی نہیں مے سے روشِ دانۂ انگور　　زاہد کا بھی ہر دانۂ تسبیحِ ریائی
کرتی ہے، صبا آ کے، کبھی، مشک فشانی　　کرتی ہے، نسیم آ کے، کبھی لخلخہ سائی
تھا، سوزنیِ خار کا، صحرا میں، جہاں فرش　　سبزے نے وہاں مخملِ خوش رنگ بچھائی
آرائشِ گل کے لیے، ہے جامۂ رنگیں　　زیبائشِ غنچہ کے لیے، تنگ قبائی
ہے، نرگسِ شہلا نے دیا، آنکھ میں کاجل　　برگِ گلِ سوسن نے، دھڑی لب پہ جمائی

ابرو پہ کرے، قوسِ قزح، وسمہ تو خورشید   سرخیِ شفق سے، کرے ریش اپنی حنائی
رُخسارۂ گل چیں کا، ہے سرخی سے یہ عالم   جوں وقتِ غضب، چہرۂ ترکانِ خطائی
کیا ساغرِ رنگیں کو کیا، جلد مہیا   نرگس نے تو، سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی
ہوتی متحمل نہیں، اک ساغرِ گل کی   شاخِ گلِ احمر کی نزاکت سے کلائی
اعجازِ نوانجیِ مطرب سے، چمن میں   ہر خار کے ہے نوک زباں شعر نوائی
حیرت کی نہیں جائے کہ دیوارِ چمن پر   ہر طائرِ تصویر، کرے نغمہ سرائی
شاہا! ترے جلوے سے ہے یہ عید کو رونق   عالم نے، تجھے دیکھ کے، ہے عید منائی
کہتے ہیں مہِ نو جسے، ابرو نے وہ تیرے   کی، آئینۂ چرخ میں ہے، جلوہ نمائی
پرتو سے ترے، جامِ مئے عیش سرِ بزم   لے ساغرِ جمشید، کرے کارروائی
ٹپکے لبِ ساغر سے وہ قطرہ گروی شکل   ہو مثلِ فلک جس میں تماشائے خدائی
کیا علم سمائے ترا، سینے میں فلک کے   دریا کی کہاں ہو سکے، کاسے میں سمائی

پڑھتا ہوں ترے سامنے وہ مطلعِ موزوں
احسنتُ، کہیں سن کے بہائیؔ و سنائیؔ

یوں کرسیِ زر پر ہے، تری جلوہ نمائی   جس طرح سے، مصحف ہو، سرِ رحلِ طلائی
رکھتا ہے تو وہ دستِ سخا، سامنے جس کے   ہے بحر بھی کشتی بہ کف، از بہرِ گدائی
گمرہ کو، ہدایت جو تری، راہ پہ لاوے   رہزن بھی اگر ہو تو کرے راہ نمائی
تا ناخنِ شمشیر، نہ ہو ناخنِ تدبیر   دشمن کی ترے، ہو نہ کبھی عقدہ کشائی
خورشید سے، افزوں ہو نشاں سجدے کا روشن   گر چرخ کرے، در کی ترے ناصیہ سائی
عکسِ رخِ روشن سے ترے، جوں یدِ بیضا   کرتا ہے کفِ آئینہ، اعجاز نمائی
کرتا ہے تری، نذر، سدا نقدِ سعادت   ہے مشتریِ چرخ کی، کیا نیک کمائی
اک مرغ ہوا کیا ہے کہ سیمرغ نہ چھوڑے   گر سر بہ ہوا ہووے، ترا تیرِ ہوائی
ہر کوہ اگر کوہ صفا ہو تو عجب کیا   ہو فیض رساں، جب ترے باطن کی صفائی

ہو بلکہ، صفا ایسی دلِ سنگِ صنم میں　　ہر بت میں، کرے صورتِ حق، جلوہ نمائی

ہر شعرِ غزل میں ترے مستیِ شفا ہیں　　قربان غزل کے تری دیوان شفائی

مانع جو ہوا دست درازی کو، ترا عدل　　پروانے کو بھی، شمع نے، انگلی نہ لگائی

زنجیر میں جوہر کی، رہی تیغ ہمیشہ　　خوں ریز کو ہو، عہد میں تیرے، نہ رہائی

دیتا ہے دعا، ذوق کہ مضمون ثنا میں　　ہے ذہن رسا کو، یہ کہاں اس کے، رسائی

ہر سال شہا، ہووے مبارک، یہ تجھے عید
تو مسندِ شاہی پہ کرے، جلوہ نمائی

سہرا

اے جواں بخت! مبارک تجھے، سر پر سہرا   آج ہے، یمن و سعادت کا، ترے سر سہرا
آج وہ دن ہے کہ لائے، دُرِ انجم سے، فلک   کشتیِ زر میں، مہِ نو کی، لگا کر سہرا
تابشِ حسن سے، مانندِ شعاعِ خورشید   رُخِ پُرنور پہ ہے، تیرے، منور سہرا
وہ کہے صلِ علیٰ، یہ کہے سبحان اللہ   دیکھیں مکھڑے پہ، جو تیرے، مہ و اختر سہرا
تا بنے اور بنی میں رہے، اخلاص بہم   گوندھیے، سورۂ اخلاص کو پڑھ کر، سہرا
گونج ہے، گلشنِ آفاق میں، اس سہرے کی   گائیں، مرغانِ نواسنج، نہ کیوں کر، سہرا
روئے فرّخ، پہ جو ہیں تیرے، برستے انوار   تارِ بارش ہے بنا ایک سراسر، سہرا
ایک کو ایک پہ تزئیں ہے، دمِ آرائش   سر پہ دستار ہے، دستار کے اوپر سہرا
اک گہر بھی نہیں، صد کانِ گہر میں چھوڑا   تیرا بنوایا ہے، لے لے کے جو گوہر، سہرا
پھرتی خوشبو سے ہے، اتراتی ہوئی، بادِ بہار   اللہ اللہ رے، پھولوں کا معطر سہرا
سر پہ طُرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدھی   کنگنا، ہاتھ میں زیبا ہے، تو سر پر سہرا
رُونمائی میں، تجھے دے، مہ و خورشید فلک   کھول دے منھ کو، جو تو منھ سے اٹھا کر سہرا
کثرتِ تارِ نظر سے ہیں تماشائیوں کے   دمِ نظارہ، ترے روئے نکو پر، سہرا
دُرِ خوش آب مضامیں سے، بنا کر لایا   واسطے تیرے، ترا ذوقِ ثنا گر، سہرا

جس کو دعویٰ ہو سخن کا، یہ سنا دے اس کو
دیکھ، اس طرح سے کہتے ہیں، سخن ور، سہرا

ذوق دہلوی سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ ان کے معاصرین میں غالب اور مومن جیسے شعرا شامل تھے۔ ذوق دہلی کے روزمروں اور محاوروں پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اصل اظہار قصیدہ گوئی میں ہوا اور اردو قصیدہ گویوں میں سودا کے بعد ذوق کو ہی سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ غزل گوئی میں بھی ذوق معمولی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کو بالعموم غالب سے موازنے کے رجحان نے نقصان پہنچایا ہے۔ غالب کے یہاں اردو غزل نصف النہار پر پہنچ جاتی ہے اور غالب کی غزل گوئی سے جب کسی شاعر کی غزل گوئی کا موازنہ کیا جاتا ہے تو اس کی غزل گوئی کے ساتھ انصاف مشکل ہوجاتا ہے۔ ذوق کی غزل کا اصل جوہر اس کا 'اردو پن' ہے۔ جس کو بالعموم ہمارے نقادوں نے نظرانداز کیا ہے۔ ذوق 1203ھ بمطابق 1788ء میں پیدا ہوئے۔ انھیں 'خاقانیِ ہند' اور 'ملک الشعرا' جیسے خطابات سے سرفراز کیا گیا۔

ان پر یہ مونوگراف پروفیسر کوثر مظہری نے تیار کیا ہے۔ پروفیسر کوثر مظہری شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں اور تنقید نگار بھی۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں جواز و انتخاب، جرأتِ افکار، اردو نظم حالی سے میرا جی تک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ISBN 978-93-5160-112-8

9 789351 601128

NCPUL New Delhi

₹ 72.00

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025